

TIGHT BINDING BOOK

brown book

*

188498

*

0UP—391—29-4-72—10,000.

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۹۳۵ و ۱۰۰۰ Accession No. 22 1355

Author م - ن - ح
حسن نظامی

Title دہلی کا آفتاب

This book should be returned on or before the date last marked below.

اکو ہندوستان ۱۹۱۱ء میں پانچویں بار چھپا کتاب
 بیمار دیش کا رومزنا چھپنے کے نام سے شائع ہوئی

دہلی کا آخری سلسلہ

حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی نے

غریبوں کے لیے کے حسن الاخبار بیٹی کے فارسی مضامین سے بذریعہ ترجمہ تیار کیا

اور

اگست ۱۹۵۷ء میں پہلی بار

ابن عربی کا رکن حلقہ مشائخ دہلی نے

دلی پرنٹنگ و کیسنگ ہاؤس کو شائع کیا

قیمت پیر

بار اول

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

دہلی کا آخری سانس

غدر شاہ کے وہ حالات جو دہلی شہر اور تیموریہ خاندان کے آخری بادشاہ اوران کی بیگمات اور شہزادوں اور دہلی کے عام باشندوں اور اس وقت کے انگریزوں کو پیش آئے۔ میں نے آٹھ حصوں میں قلم بند کر کے شائع کر دیے ہیں +

پہلے حصہ کا نام بیگمات کے آنسو، دوسرے کا انگریزوں کی پٹیا فیروزے کا محاصرہ دہلی۔ چوتھے کا بہادر شاہ کا مقدمہ، پانچویں کا گرفتار شدہ خطوط، چھٹے کا غدر کے اخبار، ساتویں کا غالب کا روزنامہ، آٹھویں کا دہلی کی جانکشی ہے +

یہ آٹھوں حصے کئی کئی بار چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ اور تمام ہندوستان کی اقوام انکو بہت شوق اور توجہ سے پڑھتی ہیں۔ اور ان میں سے کئی کتابوں کے ہندی اور گجراتی اور انگریزی ترجمے بھی ہو چکے ہیں +

اب اتفاق سے مجھ کو اسی سلسلہ کی ایک ایسی چیز ملی ہے جو آج تک کسی کتاب میں موجود نہ تھی۔ اور اردو زبان اس عجیب تاریخی ذخیرہ سے محروم تھی۔ اور جس کے مطالعہ سے علاوہ اس کے کہ دہلی کے اور بہادر شاہ بادشاہ کے بہت سے خانگی حالات معلوم ہونگے یہ بھی ثابت

ہو گا کہ غدرِ شہداء سے چند سال پہلے دہلی اور تیموری سلطنت کا آخری سانس کس قدر حسرت ناک تھا۔ اور اس منظر سے ہندوستانی دل پر کبسا اثر ہوتا ہے +

۱۵۴۰ء اور ۱۵۴۱ء اور ۱۵۴۲ء میں شائع شدہ احسن الاخبار بمبئی کا ایک فائل نواب عابد یار جنگ بہادر مرحوم ساکن حیدر آباد دکن سے محکوم حاصل ہوا۔ جو فارسی زبان میں ہے۔ اور جس میں اور شہروں کی خبروں کے علاوہ دہلی کی خبریں بھی بکثرت ہیں +

دہلی کی خبروں میں زیادہ حصہ تیموریہ خاندان کے آخری بادشاہ بہادر شاہ کے حالات خانگی کا ہے جن کے پڑھنے سے بے شمار معلوم چیزیں تاریخ کی روشنی میں آتی ہیں +

اور جزئیات کی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے لیکر بڑی بڑی اہم نامعلوم تاریخی چیزیں اس کے اندر موجود ہیں +

جب میں نے اس فائل کو پڑھا تو فوراً فارسی سے اردو ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا کیونکہ غدرِ دہلی کے سلسلہ میں ایسی کتاب کا ہونا بہت مفید تھا جس سے غدرِ شہداء سے دس گیارہ سال پہلے کے واقعات کا علم ناظرین کو ہو جائے + یہ حالات غدر سے دس گیارہ سال پہلے کے ہیں۔ جب کسی کو غدر کا وہم و

گمان ہی نہ تھا۔ اگرچہ آثارِ رنجش کے پیدا ہو گئے تھے۔ احسن الاخبار کی زبان فارسی اور خط شکستہ اور کاغذ نہایت بوسیدہ اور کمزور ہے۔ اس لیے بہت احتیاط کے ساتھ جناب مولانا سید محمد صاحب ناصر دہلوی نے اسکا اردو ترجمہ کیا۔ آئیے جگہ جگہ بریکٹ (فونین) میں اپنے حاشیے ہی مختصر الفاظ میں لکھ دے تاکہ مطالب کی تشریح ہو جائے +

ترجمہ میں کسی قسم کی کمی بیشی نہیں کی گئی۔ اصل عبارت کا پورا لفظی مفہوم لکھ دیا گیا۔ البتہ بے چوڑے القاب آداب کو بطور نمونہ کے چند جگہ لکھ کر باقی مقامات پر بخوف طوالت چھوڑ دیا گیا۔

کتاب ہذا کا مضمون اپنا تعارف خود آپ ہی کراوے گا مجھے طویل طویل تہید کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

میں نے اس کتاب کا نام دہلی کا آخری سانس ایک ناقابل بیان اثر سے متاثر ہو کر بے ساختہ رکھ دیا ہے جب میں ترجمہ کے وقت اس کے مضامین پڑھتا تھا دہلی کے گزرے ہوئے زمانہ کی کیفیات مجھ پر اس قدر غلبہ کرتی تھیں کہ میں بے اختیار کہتا تھا۔

دیکھو میری مرنے والی دہلی نے سکرات موت کے وقت

کیونکر آخری سانس لیا اور دُنیا سے چل بسی۔

یقیناً جو لوگ اس کتاب کا مطالعہ کریں گے ان پر بھی یہی کیفیت طاری ہوگی اور اور وہ بھی زمانہ کے انقلابات کو تصور میں لا کر مستحیر ہو ہو جائیں گے۔

سابقہ حسن نظامی درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین علیؒ

دہلی۔ ۳ مئی ۱۹۲۵ء

خیال میں تھا کہ بزرگوں سے کچھ خطائیں سرزد ہوئی ہیں جن میں سب سے بڑی یہ ہے کہ عاشق و معشوق کے درمیان حجاب ڈال گیا۔ یعنی حضرت محبوب الہی اور حضرت امیر خسرو کے مزارات کے بیچ میں محمد شاہ بادشاہ کو دفن کیا گیا۔ حضرت محبوب الہی اور حضرت امیر خسرو کے مابین جو محبت تھی اس کا تقاضا تھا کہ ان دونوں حضرات کے مزارات کے درمیان کوئی حجاب نہ کیا جاتا۔ کیونکہ حضرت محبوب الہی فرمایا کرتے تھے کہ اگر شریعت کا قدم درمیان نہ ہوتا تو ہم اوپر خسرو ایک قبر میں رہتے۔ ایسی صورت میں محمد شاہ کو بیچ میں دفن کرنا بہت بڑا ہوا اور تباہی سلطنت پر پڑی۔

عُرس کا جلوں

بہادر شاہ جب حضرت محبوب الہی کے عرس شریف میں حاضر ہوتے تو بڑی کیفیت ہوتی تھی۔ جب تک بادشاہ نہ آجاتے ختم نہ کر رہتے۔ جو بھی ان کی سواری آتی غل جی جاتا کہ بادشاہ آئے، خلعت کے ٹٹھکے ٹٹھکے ہوتے تھے مگر بادشاہ کے درگاہ میں داخل ہوتے ہی لوگ راستہ چھوڑ دیتے اور دروازے سے مزار مبارک تک ایک آدمی کے چلنے کے قابل راستہ بچاتا تھا جس میں سے گزر کر بادشاہ پہلے مزار مبارک پر حاضر ہوتے اس کے بعد محفل میں آجاتے۔ بادشاہ کے آتے ہی ختم شروع کر دیا جاتا اور ختم کے بعد قوالی شروع ہوتی۔ بادشاہ ایک غزل سننے اس کے بعد محفل سے چلے جاتے۔ محفل سے اٹھتے وقت ایک عجیب بہار ہوتی تھی کہ جو بھی بادشاہ نے چلنے کا رخ کیا فوراً تمام میلہ کافی کی طرح سے پھٹ گیا اور دروازے تک راستہ بن گیا۔

شاہی سگداری اور بر باد می کا زمانہ

بہادر شاہ اگر غدر کی بلا میں مبتلا نہ ہوتے تو انکی درویشی بڑے لطف و
اطمینان سے بسر ہوتی۔ مگر یہ چارے ناکردہ گناہ باغی لشکر کے وبال میں بھنس گئے
اور عمر کا آخری حصہ ہزاروں مصائب میں گزرا۔

میری والدہ ماجدہ بروایت اپنے پدر بزرگوار حضرت شاہ غلام حسن
صاحب بیان فرماتی تھیں کہ جس دن بہادر شاہ دہلی کے قلعے سے نکلے تو سیدھے
درگاہ حضرت محبوب الہی صاحب میں حاضر ہوئے اس وقت بادشاہ پر عجیب
مایوسی اور ہراس کا عالم تھا چند مخصوص خواجہ سراؤں اور ہوادار کے کہاں
کے سوا کوئی آدمی ہمراہ نہ تھا۔ فکرو اندیشہ سے بادشاہ کا چہرہ اتر اتر ہوا تھا
اور گرد و عنار سفید ڈاڑھی پر جما ہوا تھا۔ بادشاہ کی آمد سن کر نانا صاحب بدگاہ
شریف میں حاضر ہوئے۔ دیکھا کہ مزار مبارک کے سرہانے در سے تکیہ لگائے بیٹھے
ہیں۔ مجھ کو دیکھتے ہی حسب معمول بشرہ کو مقیم سڑیا میں سامنے بیٹھ گیا۔ اور خیریت دریافت
کرنے لگا جسکے جواب میں نہایت طمانیت سے بولے میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ
کم بخت باغی سپاہی خود مر ہیں۔ انہرا اعتماد کرنا غلطی ہے۔ خود بھی ڈوبیں گے مجھو بھی
ڈوبوئیں گے، آخر وہی ہوا کہ بھاگ نکلے۔ بھائی اگرچہ میں ایک گوشہ نشین فقیر ہوں
مگر ہوں اس خون کی یادگار جس میں آخر دم تک مقابلہ کرنے کی حرارت ہوتی ہے میرے
باپ داداؤں پر اس سے زیادہ آڑے وقت پڑے ہیں اور انھوں نے ہمت
نہیں ہاری مگر مجھے تو غیب سے انجام دکھا دیا گیا ہے۔ اب اس میں شک نہ کی
کوئی گنجائش نہیں کہ میں تخت ہند پر تیمور کی آخری نشانی ہوں۔ مغلی حکومت
کا چراغ دم توڑ رہا ہے اور کوئی گھڑی کا ہمان ہے۔ پھر جان بوجھ کر خواہ مخواہ

کیون خوشنریزی کراؤں۔ اس واسطے قلعہ چھوڑ کر چلا آیا۔ ملک خدا کا ہے جسکو چاہو
دے سینکڑوں برس ہماری نسل نے سر زمین ہند میں ہیبت و جبروت سے سکھ
چلایا اب دوسروں کا وقت ہے حکمرانی کریں گے، تاجدار کہلائیں گے اور ہم
ان کے مفتوح ٹھہریں گے۔ یہ کوئی رنج و افسوس کی بات نہیں آخر ہم نے بھی تو
دوسروں کو مٹا کر اپنا گھر بسایا تھا۔

ان حسرت ناک باتوں کے بعد بادشاہ نے ایک صندوق دیا اور کہا لو یہ تمہارا
سپر دہے۔ امیر تیمور نے جب قسطنطنیہ کو فتح کیا تھا تو سلطان یدرہم با یزید کے خزانے
سے یہ نعمت ہاتھ لگی تھی۔ اس میں حضور سرور کائنات کی ریش مبارک کے پانچ
بال ہیں، جو اٹک ہمارے خاندان میں بحیثیت تبرک خاص چلے آتے ہیں
اب میرے ہی لئے زمین و آسمان میں کہیں ٹھکانا نہیں، ان کو لیکر کہاں
جاؤں۔ آپ سے بڑھ کر کوئی اسکا اہل نہیں ہے۔ لیجئے ان کو رکھئے یہ میرے
دل و دیدہ کی ٹھنڈک ہیں جن کو آج کے دن کی ہولناک مصیبت میں اپنے
سے جُدا کرتا ہوں چنانچہ نانا صاحب نے وہ صندوق چلے لیا اور درگاہ شریفہ
کے توشہ خانہ میں داخل کر دیا جو اب تک موجود ہے اور ان تبرکات کی ہر سال
ربیع الاول کے مہینہ میں زیارت کرائی جاتی ہے۔

نانا صاحب سے بادشاہ نے کہا کہ آج تین وقت سے کھانے کی مہلت
نہیں ملی۔ اگر گھر میں کچھ تیار ہو تو لاؤ نانا صاحب نے کہا ہم لوگ بھی موت کے
کناسے کھڑے ہیں کھانے پکانے کا ہوش نہیں گھر جاتا ہوں جو کچھ موجود ہے حاضر
کرتا ہوں، بلکہ آپ خود گھر تشریف لے چلیں جب تک میں زندہ ہوں اور میرے
بچے سلامت ہیں آپ کو کوئی شخص ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ پہلے ہم مر جائیں گے
اس کے بعد کوئی اور وقت آسکے گا۔ بادشاہ نے فرمایا۔ آپ کا احسان

جو ایسا کہتے ہو، مگر اس بوڑھے جسم کی حفاظت کے لئے اپنے پیروں کی اولاد کو قتل گاہ میں بھیجنا مجھے کبھی گوارا نہ ہو گا۔ زیارت کر چکا، امانت سونپی ہی اب دو تھے محبوبی سنگر سے کھالوں تو مقبرہ ہمایوں میں چلا جاؤں گا وہاں جو قسمت میں لکھا ہے پورا ہو جائیگا۔

نانا صاحب گھر آئے دریا فت کیا کہ کچھ کھانے کو موجود ہے کہا گیا کہ بسنی روٹی اور سرکہ کی چٹنی ہے۔ چنانچہ وہی ایک خان میں آراستہ کر کے لے آئے اور بادشاہ نے وہ چنے کی روٹی کھا کر تین وقت کے بعد پانی پیا اور خدا کا شکر ادا بھیجا اس کے بعد ہمایوں کے مقبرے میں جا کر گرفتار ہوئے اور رنگون بھیج دیئے گئے۔ رنگون میں بھی بادشاہ کی درویشانہ معاشرت میں فرق نہ آیا۔ جب تک زندہ رہے ایک صابر و متوکل درویش کی طرح بسر وقت کرتے رہے۔

یہ وہ قصہ ہے کہ جس میں عقلمند آدمی کے لئے عبرت کا بہت بڑا ذخیرہ ہے اور جس کے سننے سے انسان اپنے غرور و تکبر کو بھول جاتا ہے اور جب دماغ سے تکبر کی بوجھ جاتی رہتی ہے۔ تو آدمی اہل آدمی بن جاتا ہے۔

دوسرا فسانہ شہزادے کا بازار میں گھسٹنا

یہ دہلی جس کو ہندوستان کا دل اور حکومت کا تخت گاہ کہتے ہیں جب آباد تھی اور لال قلعہ میں مغلوں کی آخری شمع ٹٹما رہی تھی آفت اور بلا میں

بہتلا ہوئے کو ہونی تو پہلے اس کے باشندوں کے عمل میں فرق آیا آیتنا علی
 دین ملو گھم پہلے حاکموں کے اعمال خراب ہوئے اسکی رعیت بھی بدعالیوں
 میں پڑ گئی نتیجہ یہ ہوا کہ راجا پر جادوؤں برباد ہو گئے۔ مثالیں ہزاروں
 ہیں مگر ذیل میں ایک نہایت عبرت ناک کہانی سننا کہ میں باشندگان ہند
 کو عواماً و مسلماً نوں اور صوفیوں کو خصوصاً خدا کے خوف سے ڈراتا ہوں۔

(۱)

غدر سے ایک برس پہلے دہلی سے باہر جنگل میں چند شہزادے شکار کھیلتے
 پھرتے تھے اور بے پرواہی سے چھوٹی چھوٹی چڑیوں کا خنڈوں کو جو د د پہر کی
 دھوپ سے بچنے کے لئے درختوں کی ہری بھری ٹہنیوں پر خدا کی باد کی شمع
 پڑھ رہی تھیں غلے مار رہے تھے کہ سامنے سے ایک گڈری پوش فقیر آ نکلا۔ اور
 اس نے نہایت ادب سے شہزادوں کو سلام کر کے عرض کیا کہ میاں صاحبزادو! ان
 بے زبان جانوروں کو کیوں ستاتے ہو انہوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے
 ان کے بھی جان ہے یہ بھی تمہاری طرح دکھ اور تکلیف کی خبر رکھتے ہیں۔ مگر
 بے بس ہیں اور نرسے کچھ نہیں کہہ سکتے تم بادشاہ کی اولاد ہو بادشاہوں کو اپنے ملک کے
 دلوں پر محبت اور مہربانی کرنی چاہئے یہ جانور بھی ملک میں رہتے ہیں ان کے
 ساتھ بھی رحم اور انصاف برتا جائے۔ تو شان بادشاہی سے دُور نہیں پڑے
 شہزادے نے جس کی عمر ۱۸ برس کی تھی شرمناک غلیل ہاتھ سے رکھ دی مگر چھوٹے
 مرزا نصیر الملک بگڑ کر بولے "جبارے جا۔ دوٹکے کا آدمی ہم کو نصیحت کرنے
 نکلا ہے۔ تو کون ہوتا ہے۔ ہکو سمجھانے والا۔ سیر و شکار سب کرتے ہیں ہم نے
 کیا تو کون گناہ ہو گیا" فقیر بولا "صاحب عالم ناراض نہ ہوں۔ شکار ایسے
 جانوروں کا کرنا چاہئے کہ ایک جان جائے تو دس پانچ جانوں کا بیٹ تو بھر

ان ننھی ننھی چڑیوں کے مارنے سے کیا نتیجہ۔ بین مار دگے تب بھی ایک آدمی شکم سیر نہو گا، نصیر مرزا فقیر کے دوبارہ بولنے سے آگ بگولا ہو گئے اور ایک غلہ غلیل میں رکھ کر فقیر کے گھٹنے میں اس زور سے مارا کہ بچارہ منہ کے بل گر پڑا اور بے اختیار اس کی زبان سے نکلا ”ہائے ٹانگ توڑ ڈالی“ فقیر کے گرتے ہی شہزادے گھوڑوں پر سوار ہو کر قلعے کی طرف چلے گئے اور فقیر گھسٹتا ہوا سامنے کے قبرستان کی طرف چلنے لگا گھسٹتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا ”وہ تخت کیونکر آباد رہے گا جس کے وارث ایسے سفاک ظالم ہیں۔ لڑکے تو نے میری ٹانگ توڑ دی خدا تیری بھی ٹانگیں توڑے اور تجھ کو بھی اسی طرح گھسٹنا نصیب ہو۔“

(۲)

تو پس گرج رہی تھیں گولے برس رہے تھے زمین پر چاروں طرف لاشوں کے ڈھیر نظر آتے تھے۔ شہر دہلی ویران اور سنان ہوتا جاتا تھا کہ لال قلعے سے پھر ہی چند شہزادے گھوڑوں پر سوار بدحواسی کے عالم میں بھاگتے ہوئے نظر آئے اور پہاڑ گنج کی طرف جانے لگے۔ دوسری طرف میں پچیس گورے سپاہی دھاوا کرتے چلے آتے تھے انھوں نے ان نو عمر سواروں پر یک سخت بندو قوں کی بارش ماری گولیوں نے گھوڑوں اور سواروں کو چھلنی کر دیا اور یہ سب شہزادے فرش خاک پر گر کر خون میں تر پینے لگے۔ گورے جب قریب آئے تو دیکھا دو شہزادے جاں بحق ہو چکے ہیں۔ مگر ایک سانس لے رہا ہے۔ ایک سپاہی نے زندہ شہزادے کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تو معلوم ہوا کہ اس کے کہیں زخم نہیں آیا گھوڑے کے گرنے سے معمولی کھربچیں آگئی ہیں اور دہشت کے مارے غشی طاری ہو گئی ہے صحیح سالم

دیکھ کر گھوڑے کی باگ ڈور سے شہزادے کے ہاتھ باندھ دیے گئے اور
حراست میں کر کے دو سپاہیوں کے ہاتھ کمپ میں بھجوا دیا گیا۔ کمپ پہاڑی
پر تھا جہاں گوروں کے علاوہ کالوں کی فوج بھی تھی جب بڑے صاحب کو
معلوم ہوا کہ یہ بادشاہ کا پوتا نصیر الملک ہے تو وہ بہت خوش ہوئے
اور حکم ہوا کہ اس کو حفاظت سے رکھا جائے۔

(۳۵)

باغیوں کی فوجیں شکست کھا کر بھاگنے لگیں اور انگریزی لشکر لیٹا کر تا
ہوا شہر میں گھس گیا۔ بہادر شاہ ہایوں کے مقبرے میں گرفتار ہو گئے تیوری
بزم کا چراغ جھلکا کر گل ہو گیا۔ اور جنگل شریف زادیوں کے برہنہ سروں و
کھلے چہروں سے آباد ہونے لگا۔ باپ بچوں کے سامنے ذبح ہونے لگے اور
بائیں اپنے جوان بیٹوں کو خاک و خون میں لٹتا دیکھ کر چھین مارنے لگیں۔

اسی دار و گیر میں پہاڑی کمپ بہر مرزا نصیر الملک رسی سے بندھے
بیٹھے تھے کہ ایک پٹھان سپاہی دوڑا ہوا آیا اور کہا جائے میں نے آپ کی
رہائی کے لئے صاحب سے اجازت حاصل کر لی ہے۔ جلدی بھاگ جاؤ ایسا
نہ ہو کہ کسی دوسری بلا میں پھنس جاؤ۔

مرزا بچارے پیدل چلنا کیا جانیں حیران تھے کیا کریں۔ لیکن مرتا کیا کرتا
پٹھان کا شکریہ ادا کر کے نکلے اور جنگل کی طرف ہو لئے چل رہے تھے
مگر یہ خبر نہ تھی کہ کہاں جاتے ہیں۔ ایک میل چلے ہوئے کہ بیروں میں جھپاڑ
پڑ گئے زبان خشک ہو گئی جلق میں کانٹے پڑنے لگے ٹھک کر ایک درخت
کے سایے میں گر پڑے اور آنکھوں میں آنسو بھر کر آسمان کی طرف دیکھا کہ اتنی
یہ کیا غضب ہم پر ٹوٹا۔ ہم کہاں جائیں کہ ہر ہمارا ٹھکانہ ہے اوپر نگاہ اٹھائی

تو درخت پر نظر گئی دیکھا کہ فاختہ کا ایک گھونسل بنا ہوا ہے اور وہ آرام سے اپنے انڈوں پر بیٹھی ہے، اس کی آزادی اور آسائش پر شہزادہ کو بڑا رشک آیا اور کہنے لگے کہ فاختہ! مجھ سے تو تو لاکھ درجے بہتر ہے کہ آرام سے اپنے گھونسلے میں بے فکر بیٹھی ہے میرے لئے تو آج زمین آسمان میں کہیں گجھ نہیں ہے۔

تھوڑی دور ایک بستی نظر آتی تھی۔ بہت کر کے وہاں جانے کا ارادہ کیا۔ اگرچہ پاؤں کے چھالے چلنے نہ دیتے تھے مگر شتم پشتم گرتے پڑتے وہاں پہنچے تو عجیب سماں نظر آیا۔ ایک درخت کے نیچے سینکڑوں گنوار جمع تھے اور چوبترہ پر ایک تیرہ سال کی جسمیں لڑکی بیٹھی تھی جسکے چہرہ پر ہوا سیاں اڑ رہی تھیں۔ کان بواہان ہو رہے تھے۔ اور دہقان اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ جو ہنی مرزا کی نگاہ اس بچی پر پڑی اور اس بچاری نے مرزا کو دیکھا دونوں کی چھین مکھ گئیں۔

بھائی بہن کو اور بہن بھائی کو چمٹ کر رونے لگے۔ مرزا نصیر الملک کی یہ چھوٹی بہن اپنی والدہ کے ساتھ رختہ میں رہ کر قلعہ قطب صاحب چلی گئی تھی مرزا کو گمان بھی نہ تھا کہ وہ اس آفت میں مبتلا ہو گئی ہوگی۔ پوچھا ملکہ تم یہاں کہاں؟ رو کر بولی

اکاجی گوجروں نے ہکو لوٹ لیا نوکروں کو مار ڈالا اماں جان کو دوسرے گاؤں والے لیکے اور مجھ کو یہاں لے آئے میری بالیاں انھوں نے نوح لیں میرے طاپے ہی طاپے مارے ہیں۔

آنا بکرا! لڑکی کی پہلی بندہ گئی اور پھر کوئی لفظ اس کی زبان سے نہ نکلا۔!

بے کس شہزادے نے اپنی خریب بہن کو دلاسا دیا اور ان گنواروں سے عاجزی کرنے لگا کہ اسکو چھوڑ دو۔ گوجر بڑا کر بولے۔ ارے جہاں بڑا بچارا۔ ایک گنڈا سا لایا سا مینگو کہ گرون کٹ جائیگی۔ اسکو ہم دوسرے گاؤں سے لائے ہیں لا دام دے جا اور لیجا۔

مزانے کہا۔ چودھریو! دام کہاں سے دوں میں تو خود تم سے روٹی کا ٹکڑا مانگتے
 کے قابل ہوں۔ دیکھو ذرا رحم کرو۔ کل تم ہماری رعیت تھے اور ہم بادشاہ کہلاتے تھے
 آج آنکھیں نہ پھیرو۔ خدا کسی کا وقت نہ بگاڑے۔ اگر ہمارے دن پھر گئے تو مال مال
 کر دینگے۔ یہ سنکر گنوار بہت ہنسنے اور کہنے لگے۔ اوہو آپ بادشاہ سلامت ہیں۔
 تب تو ہم تم کو فرنگیوں کے ہاتھ بیچیں گے اور یہ چھو کر می تو اب ہمارے گاؤں کی ٹہل
 کر لی۔ جھاڑو دیگی۔ ڈھوروں کے آگے چارہ ڈالے گی۔ گو برا ٹھائے گی۔
 یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سلسلے سے انگریزی فوج آگئی اور گاؤں والوں کو گھیر لیا اور چار
 چودھریوں کو ادران دونوں شہزادے بہن زادی کو بکڑ کر لیگئے۔

(۴)

چاندنی چوک کے بازار میں پھانسیاں گڑی ہوئی تھیں اور جھکوانگریزی افسر کہہ دیتے
 کہ قابل دار ہے اسی کو بھانسی بل جانی تھی ہر روز سینکڑوں آدمی دار پر لٹکائے جلتے
 گولیوں سے اڑائے جاتے اور تلوار سے ذبح ہوتے تھے۔ ہر طرف اس خونریزی سے تھک چکا
 مزانہ فی الملک وراہ کی بہن بھی بڑے صاحب کے سامنے پیش ہوئے اور صاحب نے ان دونوں
 کو غور و سال دیکھا بے قصور سمجھا۔ اور چھوڑ دیا دونوں بچات پاکر ایک سوداگر کے ہاں نوکر
 ہو گئے ٹوکی سوداگر نے بچے کو کھلاتی تھی۔ اور نصیر الملک بازار کا سودا سلف لایا کرتے تھے
 چند روز کے بعد ٹوکی تو بیضہ میں مبتلا ہو کر مر گئی اور مرزا کچھ دن ادھر نوکریاں چاکریاں کرتے
 رہے۔ آخر کار سرکار نے انکی پانچ روپیہ ماہوار پنشن مقرر کر دی۔

ایک برس کا ذکر ہے۔ دہلی کے بازار چٹلی قبر کمرہ بنگلہ وغیرہ میں ایک پیر مرد جنکا چہرہ
 چنگیزی نسل کا بہتہ دیتا تھا۔ کوہلوں کے بل گھنٹے پھر کرتے تھے۔ انکے پاؤں شاید فالج سے بیکار
 ہو گئے تھے اسلئے ہاتھوں کو ٹیک کر کوہلوں کو ٹھپتے ہوئے راستہ چلتے تھے۔ انکے گلے میں ایک
 جمولی ہوتی تھی۔ دو قدم چلتے اور راہ گیروں کو حسرت سے دیکھتے گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں

اپنی محتاجی ظاہر کر کے بھیک مانگتے تھے جن لوگوں کو انکا حال معلوم تھا ترس کھا کر جھولی میں کچھ ڈال دیتے تھے۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ ان کا نام مرزا نصیر الملک ہے اور یہ بہادر شاہ کے پوتے ہیں۔ سرکاری پنشن قرضہ میں برباد کر دی اور اب خاموش گداگری پر گزارہ ہے مجھ کو ان کے حال سے عبرت ہوتی تھی۔ اور جب ان کا ابتدائی قصہ جو کچھ خود ان کی زبانی اور کچھ دوسرے شہزادوں کی زبانی سنا تھا یاد آتا تو دل ہل جاتا تھا کہ اس فقیر کا کہنا پورا ہوا جسکی ٹانگ میں انھوں نے غلہ مارا تھا۔ شہزادہ صاحب کا بازو میں گھسٹا پھرنا سخت سخت دل کو ہم کر دیتا تھا اور خدا کے خوف سے دل کانپ جاتا تھا۔ اب ان شہزادہ صاحب کا انتقال ہو گیا۔

تیسرا فسانہ تیم شہزادہ کی ٹھوکریں

ماہ عالم ایک شہزادے کا نام تھا جو شاہ عالم بادشاہ دہلی کے نواسوں میں تھا اور تدریس اسکی عمر صرف گیارہ برس کی تھی۔ شہزادہ ماہ عالم کے باپ مرزا نور محمد دیگر خاندان شاہی کی طرح بہادر شاہ کی سرکار سے سو روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے تھے مگر انکی والدہ کے پاس قدیم زمانہ کا بہت سا اندوختہ تھا اسلئے انکو اس روپیہ کی چنداں پروا نہیں تھی اور وہ بڑی بڑی تنخواہوں کے شہزادوں کی طرح گذراوقات کرتے تھے۔ جب غدر پڑا تو ماہ عالم کی والدہ بیمار تھیں علاج ہو رہا تھا۔ مگر مرض برابر ترقی کرتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ عین اس روز جبکہ بہادر شاہ قلعہ سے نکلے اور شہر کی تمام رعایا پریشان ہو کر جباروں طرف بھاگنے لگی۔ ماہ عالم کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ ایسی گھبراہٹ کے موقع پر سب کو اپنی جان کے لئے پڑے ہوئے تھے اس موت نے عجیب ہراس

پیدا کر دی۔ اس وقت نہ کفن کا سامان ممکن تھا نہ دفن کا۔ نہ غسل دینے والی عورت
میسر آ سکتی تھی۔ نہ کوئی مردے کے پاس بیٹھنے والا تھا۔ نہ ہزاروں میں رسم ہو گئی تھی کہ
وہ مردے کے پاس نہ جاتے سب کام پیشہ وروں سے لیا جاتا تھا۔ جو اس وقت کیلئے
ہمیشہ موجود تیار رہتے تھے۔ غدر کی عالمگیر مصیبت کے سبب کوئی آدمی ایسا نہ ملا
جو تجہیز و تکفین کی خدمت انجام کو پہنچاتا۔ گھر میں دو لونڈیاں تھیں لیکن وہ بھی مردے کو
نہلانا نہ جانتی تھیں۔ خود مرزا انور وزیر اگرچہ پڑھے لکھے شخص تھے مگر چونکہ انکو ایسا کام
پیش نہ آیا تھا اسلئے اسلامی طریق پر غسل و کفن سے وہ بھی واقفیت نہ رکھتے تھے۔

القصد ان لوگوں کو اسی حیرانی و ہرشیانی میں کئی گھنٹے گزر گئے اتنے میں منانہ انگریزی
شکر شہر میں گھس آیا ہے اور اب عنقریب قلعہ میں آیا جا رہا ہے۔ اس خبر سے مرزا کے
رہے سہمے اوسان بھی جاتے رہے اور جلدی سے لاش کو چار پانی پر ہی کپڑے اتار کر
نہلانا شروع کیا۔ نہلایا کیا۔ بس پانی کے بوتلے بھر بھر کر اوپر ڈال دیئے کفن کہاں سے
ملا شہر تو بند تھا۔ پلنگ پر بچھانے کی دو اٹلی چادریں لیں اور ان میں لاش کو لپیٹ دیا
اب یہ فکر ہوئی کہ دفن کہاں کریں باہر لیجانے کا تو موقع نہیں اسی سوچ میں گئے کہ گورڈ
اور سکھوں کی فوج کے چند سپاہی گھر میں آ گئے اور آتے ہی مرزا اور انکے لڑکے ماہ عالم
کو گرفتار کر لیا اسکے بعد گھر کا سامان لوٹنے لگے۔ صندوق توڑ ڈالے الماریوں کے
کوڑا اکھیر دیئے۔ کتابوں میں آگ لگا دی دونوں لونڈیاں غسل خانوں میں جا چھپی تھیں
ایک سپاہی کی ان پر نگاہ پڑ گئی جس نے دیکھتے ہی اندر گھسکر سر کے بال بکڑے اور بچاؤ نکو
گھسیٹا ہوا باہر لے آیا۔ اگرچہ ان فوجیوں کو لاش کا حال معلوم ہو گیا تھا مگر انھوں نے
اسکی مطلق پرواہ نہ کی اور برابر لوٹ مار کرتے رہے۔ آخر قیمتی سامان کی گھڑیاں بٹولیاں
اور خود مرزا انور وزیر اور انکے لڑکے ماہ عالم کے سر پر پھیں اور بکریوں کی طرح گھو
ہا نکلے ہوئے گھر سے باہر لیچے اس وقت مرزا نے اپنے لئے ہوئے گھر کو آخری حشر بھری

نگاہوں سے دیکھا اور اپنی بیوی کی بے گور و کفن لاش کو اکیلا چار بائی پر چھوڑ کر غلی سپاہیوں کے ساتھ کوچ کیا۔

لوڈیوں کو تو بوجھ اٹھانے اور چلنے پھرنے کی عادت تھی مرزا نور و زحید بھی قوی اور توانا تھے۔ بوجھ سر پر اٹھائے بے تکان چل رہے تھے۔ مگر غیب ماہ عالم کی بڑی حالت تھی اول تو اس کے سر پر بوجھ اس کی عمر اور بباط سے زیادہ تھا۔ اسکے علاوہ یہ شہزادہ قدرتی طور پر نہایت نازک اور کمزور واقع ہوا تھا۔ اس پر سونے پر ہماگ یہ ہوا کہ ماں کے مرنے کا غم تھا۔ رات سے روتے روتے آنکھیں جگ گئی تھیں۔ خالی ہاتھ چلنے سے جکڑ آتے تھے کجا یہ نوبت کہ سر پر بوجھ بھیجے چلتی ہوئی تلواریں اور جلدی چلنے کی تہرناک تاکید بچارے کے پاؤں لڑکھڑاتے تھے۔ دم چڑھ گیا تھا۔ بدن پسینہ پینہ ہو گیا تھا آخر نہایت مجبوری کی حالت میں باپ سے کہا: ابا حضرت مجھ سے تو چلا نہیں جاتا۔ گردن بوجھ کے مارے ٹوٹی جاتی ہے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا رہا ہے۔ ایسا نہ ہو گر پڑوں۔ باپ اپنے لاڈلے کو تہیے کی مصیبت بھر پٹی تھی نہ گئیں اور اس نے لڑکر سپاہی سے کہا: صاحب اس بچے کا اسباب بھی مجھ کو دیدو یہ بیمار ہے گر پڑیگا۔ گورا حزا کی زبان بالکل نہ سمجھا اور اس طرح ٹھہرنے اور بات کرنے کو گستاخی اور بدینتی سمجھ کر دو تین گھنٹے کمر میں مارے اور آگے دھکا دیدیا۔ مظلوم مرزا نے مار بھجی کھائی مگر ماتا کے مارے لڑکے کا بوجھ لیکر بغل میں لے لیا۔ گورے کو یہ حرکت بھی پسند نہ آئی اور اس نے جبراً مرزا سے گٹھری لیکر ماہ عالم کے سر پر رکھ دی اور ایک گھونسا اس بیکس و ناتوان کے بھی مارا گھونسا کھا کر ماہ عالم آہ لہکر گر پڑا اور بیہوش ہو گیا۔ مرزا نور و زانے سخت جگر کی حالت دیکھ کر جوش میں آ گئے اور اسباب پھینک کر ایک مکہ گورے کے کٹ پر سید کیا اور بھر فوراً ہی دوسرا گھونسا اس کی ناک پر مارا جس سے گورے کی ناک کا بانسہ پھٹ گیا اور خون کا فوارہ چلنے لگا سکھ سپاہی سری طرح

چلے گئے تھے۔ اس وقت فقط دو گورے ان قیدیوں کے ساتھ تھے اور کیمپ کو لئے جا رہے تھے۔ دوسرے گورے نے اپنے ساتھی کی یہ حالت دیکھ کر مرزا کے ایک سنگین ماری مگر خدا کی قدرت سنگین کا دارا و چھا پڑا اور وہ مرزا کی کمر کے پاس سو کھال چھیلتی ہوئی نکل گئی۔ تیموری شہزادہ نے اس موقع کو غنیمت جانا اور ایک کرا ایک مکہ اس گورے کی ناک پر بھی مارا۔ یہ مکہ بھی ایسا کاری پڑا کہ ناک پچک گئی اور خون بہنے لگا گورے یہ حالت دیکھ کر بستوں و کرج تو بھول گئے اور ایک بار گدی دونوں کے دونوں مرزا کو چمٹ گئے اور گھونسوں سے مارنے لگے۔ لونڈیوں نے جو یہ حالت دیکھی تو اسباب پھینک رستہ کی خاک مٹھیوں میں بھر گوروں کی آنکھوں میں جھونک دی رہا ناگہانی آفت سے گورے تھوڑی دیر کے لئے بیکار ہو گئے اور ان کی کرج مرزا کے ہاتھ آگئی۔ مرزا نے فوراً کرج گھسیٹ لی اور ایک ایسا بھر پور ہاتھ مارا کہ کرج نے شانے سے سینہ تک کاٹ ڈالا۔ اس کے بعد دوسرے گورے پر حملہ کیا اور اسے بھی قتل کر دیا ان دونوں کو ہلاک کر کے ماہ عالم کی طرف متوجہ ہوئے وہ بالکل بہوش تھا۔ باب کے گود میں لیتے ہی آنکھیں کھول دیں اور بائیں گلے میں ڈاکر رونے لگا۔ مرزا اسی حالت میں تھے کہ پیچھے سے دس بارہ گورے اور کچھ سپاہی آگئے اور انہوں نے اپنے دو ساتھیوں کو خون میں نہایا دیکھ کر مرزا کو گھیر لیا اور لڑکے کی طرح جڈا کر کے حال پوچھا۔ مرزا نے سارا واقعہ سچ سچ کہہ دیا سنتے ہی گوروں کی حالت غصہ سے غیر ہو گئی۔ انہوں نے بستوں کے چھ فیہر یکدم کر دیے جن سے زخمی ہو کر مرزا اگر پرک اور آٹا فائنا میں تڑپ کر مر گئے۔ مرزا نوروز کی لاش کو وہیں چھوڑ دیا گیا اور ماہ عالم کو لونڈیوں سمیت پہاڑی کے کیمپ میں لے گئے۔

جب دہلی کی فتح سے اطمینان ہو گیا تو لونڈیاں دو پنجابی افسروں کو دیدی گئیں اور ماہ عالم ایک انگریز افسر کی خدمت گزار پر مامور ہوئے جب تک یہ انگریز دہلی

میں رہے ماہ عالم کو زیادہ تکلیف نہ تھی۔ کیونکہ صاحب کے پاس کئی خاشاں اور نوکروں
چاکر تھے اس واسطے زیادہ کام کاج نہ کرنا پڑا تھا۔ لیکن چند روز کے بعد یہ صاحب
خصمت لیکر ولایت چلے گئے اور ماہ عالم کو ایک دوسرے افسر کے حوالہ کر گئے۔
جو میرٹھ چھاؤنی میں تھے۔ ان افسر کا مزاج سخت تھا۔ بات بات پر ٹھوکریں مارتے تھے۔
ماہ عالم اس مارد ہار کو برداشت نہ کر سکے اور ایک دن بھاگنے کا ارادہ
کیا چنانچہ پچھلی رات کو گھر سے نکلے۔ پہرہ دار نے ٹوکا تو کہہ دیا فلاں صاحب کا نوکر
ہوں اور ان کے کام کو فلاں گاؤں میں جانا ہوں تاکہ سویرے ہی پہنچ جاؤں اس
حیلہ سے جان بچائی اور جنگل کا راستہ لیا۔

چھوٹی عمر۔ راستے سے پیچھے بکڑے جانیکا خوف عجب پریشانی کا عالم تھا آخر ہزار
دقت صبح ہوتے ہوتے میرٹھ سے تین چار کوس کے فاصلہ پر پہنچ گئے۔ سامنے گاؤں
تھا وہاں جا کر ایک مسجد میں ٹھہر گئے ملا صاحب نے سوالات شروع کئے تو کون سے کہاں
سے آیا ہے۔ کہاں جائیگا۔ ماہ عالم نے ان کو باتوں میں ٹالا یہاں ایک نئے ہی ٹھہرے ہوئے
تھے انہوں نے جو ماہ عالم کی شریفانہ صورت دیکھی۔ تو محبت سے پاس بلایا اور سنا
کی بچی ہوئی روٹی سامنے رکھی۔ ماہ عالم نے شاہ صاحب کو ہمدردی پکار اپنی مصیبت کی
داستان اول سے آخر تک سنائی شاہ صاحب یہ کیفیت سن کر رونے لگے اور ماہ عالم
کو سینہ سے لگا کر پیار کیا اور تسلی کی باتیں کرنے لگے۔ اس کے بعد کہا اب تم فکر نہ کرو میرے
ساتھ رہو خدا حافظ و نا صر ہے۔

چنانچہ انہوں نے ایک رنگین کرتا انکو پہنا دیا اور ساتھ لیکر چل کھڑے ہوئے
دو چار روز تو یہ حالت رہی کہ جہاں ماہ عالم لے کہا حضرت ایتوں میں تھک گیا تو کسی
گاؤں میں ٹھہر جاتے۔ لیکن پھر ان کو بھی چلنے کی عادت ہو گئی اور پوری منزل چلنے لگے
پہنچے پھر میں اجیر شریف پہنچے۔ یہاں ان صاحب کے پیروں بغداد کے رہنے والے تھے

بلے ان پر صاحب کو جب ماہ عالم کا حال معلوم ہوا تو وہ بھی مہربانی سے پیش آئے اور ان دونوں کو ساتھ لیکر بھیجی چلے گئے۔ بیہوشی کے قریب بانو رہ میں شاہ صاحب تھے وہیں انکو بھی رکھا اور کئی برس یہاں رہ کر ماہ عالم نے قرآن فریفت اور ستر سال کی کتابیں پڑھیں اور نماز روزے سے خوب واقف ہو گئے۔ تب شاہ صاحب نے ان کی ویش کسی نیک بخت سے شادی کر دی اور انھوں نے اسی جگہ رہنا اختیار کیا۔

چوتھا فسانہ

شہزادی کی بیست

ہونے کو تو عذر پچاس برس کی کہانی ہے۔ مگر نجمہ سے پوچھو تو کل کی سی بات معلوم ہوئی ہے۔ اُن دنوں میری عمر سولہ سترہ برس کی تھی میں اپنے بھائی سے دو برس چھوٹی اور مرنے والی بہن ناز بانو سے چھ سال بڑی ہوں۔ میرا نام سلطان بانو ہے آبا جان مرزا قویش بہادر ظل سحانی حضرت بہادر شاہ کے فردِ دند تھے۔ بھائی یاوہر شاہ اور ہم بہنوں میں بڑی محبت تھی۔ بس ہر ایک دوسرے پر فدا تھا۔ آکا بھائی کے لئے باہر کسی اُستاد طرح طرح کی باتیں سکھانے والے تھے، کوئی حافظ تھا اور کوئی مولوی کوئی خوشنویس تھا اور کوئی تیر انداز۔

اور ہم محل میں سینا پر دانا اور کشیدہ کاڑھنا ملا کر بیٹھتے تھے ورنہ کھانا کھانے کے بعد اور بڑوں پر خاص نظر رعایت رکھتے تھے۔ ان کو صبح کا کھانا شاہی و سترخان پر حضورِ الہی کے ہمراہ کھلایا جاتا تھا، چنانچہ ظل سحانی مجھ کو بھی بہت چاہتے تھے اور کیا ہمیشہ صبح کے وقت کھانے کے واسطے بلائی جاتی تھی جب بیٹھنے ہوئے ہوتا تھا اور سچا

ابو بکر کے لڑکے مرزا سہراب سے میری نسبت ٹھیکر گئی تو حضور کے دسترخوان پر جاتے ہوئے شرم آتی تھی کیونکہ وہاں مرزا سہراب بھی کھانا کھانے آیا کرتے تھے، اگرچہ ہمارے کل خاندان میں باہم پردہ نہ تھا اور نہ اب ہے۔ شرعی نامحرم گھر میں آتے جاتے تھے مگر میں اپنی طبیعت سے مجبور تھی۔ میں ایک آن کے لئے رسی غیر مرد کے سامنے جانا گوارا نہ کرتی تھی۔ پر کیا کرئی حضور کے حکم کے خلاف دسترخوان پر کس طرح نہ جانی۔ لیکن یہ غنیمت تھا کہ آداب سلطانی کے باعث سب نظریں جھٹ سے رکھتے تھے۔ مجالِ نمی کہ ایک بچہ بھی ادھر ادھر دیکھے۔ یا آواز سے بولے۔

قاعدہ تھا کہ جب حضور معلیٰ کوئی خاص کھانا کسی کو مرحمت فرماتے تو وہ بچہ ہو یا جوان عورت ہو یا مرد اپنی جگہ سے اٹھ کر جائے ادب پر جاتا اور جھک کر قتلِ سلام بجالاتا۔ ایک دن میرے ساتھ بھی یہی اتفاق پیش آیا کہ حضور نے ایک نئی قسم کا ایرانی کھانا مجھ کو عطا کیا۔ اور فرمایا سلطان! تو تو کچھ کھاتی ہی نہیں، ادب اور سحاط ایک حد تک اچھا ہوتا ہے نہ کہ اتنا کہ دسترخوان پر سے بھوکا اٹھا جائے۔ میں کھڑی ہوئی اور جائے ادب پر جا کر تین آداب بجالائی مگر کچھ نہ پوچھا اس شکل سے آئی گئی کہ دل ہی جانتا ہے ہر قدم پر او بھتی تھی اور اوسانِ خطا ہوئے جاتے تھے۔

اب میں سوچتی ہوں کہ وہ زمانہ کیا ہوا وہ خوشی کے دن کہاں چلے گئے جب ہم اپنے محلوں میں آزاد و بی فکر بچہ کرتے تھے ظلِ سبحانی کا سایہ سر پر تھا اور لوگ ہمیں ملکہ عالم کہہ کر پکارتے تھے۔ دنیا کے آثار چڑھاؤ ایسے ہی ہوتے ہیں۔

مجھے خوب یاد ہے کہ جب حضور محلِ مقبرہ ہمایوں میں گرفتار کے گئے تو مرزا سہراب تلوار گھسیٹ کر دوڑے مگر دوسرے گورے نے ان کے گولی مار دی اور وہ لپک آہ کر کے گر پڑے اور ٹرپ کر ٹھنڈے ہو گئے اور میں بت بنی تماشا دیکھتی رہی۔ قتل میں خواجہ سرا آیا اور کہنے لگا بیگم کیوں کھڑی ہو چلو تمہارے آبا جان نے بلا یا ہے

میں اسی بیخودی کے عالم میں اُس کے ساتھ ہوئی۔ دریائی دروازے سے اُتر کر دیکھا کہ آبا جان مرزا قویش بہادر گھوڑے پر سوار ننگے سر کھڑے ہیں مقام چہرے اور سر کے بال خاک آلودہ ہو رہے ہیں مجھے دیکھتے ہی آنسو بھر لائے اور فرمایا لو سلطانہ آہمارا بھی کوچ ہے۔ جوان مہیا جس کے سرے کی آرزو تھی آنکھوں کے سامنے ایک سکھ کی سنگین کا نشان بن گیا یہ سننے ہی میں نے ایک چیخ ماری اور ہائے بھائی یاد رکھ کر رونے لگی۔ وہ گھوڑے سے اُتر آئے۔ مجھ کو اور ناز بانو کو گلے لگا کر پیار اور تسلی دینے لگے اور کہا بیٹی اب لوگ میری تلاش میں ہیں۔ میں بھی دوپار گھر کی کاہن ہوں۔ تم ماشاء اللہ جوان اور سمجھدار ہو اپنی چھوٹی بہن کو دلاسا دو اور آئیواں مصیبت پر صبر کرؤ۔ خبر نہیں اس کے بعد کیا پیش آئیواں ہے۔ جی تو نہیں چاہتا کہ ملکوت تنہا چھوڑ کر کہیں جاؤں پر ایک نہ ایک دن بہتیں بن باپ کا بننا ہی پڑے گا۔ ناز بانو تو ابھی بچہ ہے اس کی دلدادہی کرنا اور نیکی سے زندگی بسر کرنا۔ اور دیکھو ناز بانو اب تم شہزادی نہیں ہو کسی چیز کے لئے ضد نہ کرنا جو میرے شکر کر کے کھالینا اور اگر کوئی شخص کچھ کھاتا ہو تو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا ورنہ لوگ کہیں گے کہ شہزادیاں بڑی بدنیت ہوتی ہیں پھر ہم دونوں کو خواجہ سرا کے سپرد کر کے کہا ان کو جہاں ہمارے خاندان کے اور آدمی ہوں پہنچا دینا اس کے بعد ہکو پیار کیا اور روتے ہوئے گھوڑا دوڑاتے جنگل میں گھس گئے۔ پھر پتہ نہ لگا کہ وہ کیا ہوئے۔ خواجہ سرا ہکو لے چلا۔ یہ ہمارے گھر کا بیٹا منکھوار تھا۔ سوڑی دور تک ناز بانو جو نازوں کی پی ہوتی تھی چلی مگر پھر باؤں کی نکت نے جواب دیدیا اور دو قدم چلنا دُوبھر ہو گیا۔ مجھ کو بھی کبھی بیدل چلنے کا اتفاق نہ ہوا جگہ جگہ ٹھوکریں کھاتی تھی مگر بانو کو لئے ہوئے چلی جاتی تھی اتنے میں ناز بانوں کے ایک نوکر کا نشانچہ چھ گیا اور وہ ہائے کہہ کر گر پڑی۔ میں نے جلدی سے اُس کو اٹھایا اور کاشا بکالے لگی۔ مگر خواجہ سرا کھڑا دیکھا کیا اور یہ نہ ہوا کہ میرا ہاتھ بٹالیتا بلکہ چلنے کی

جلدی کوئے لگا۔ بہن بولی آپا جان مجھ سے پیدل نہیں چلا جاتا۔ ناظر کو بھیج کر گھر سے ہالکی منگالو۔ گلو اور ہالکی کا نام مشکو میراجی بھر آیا اور اس کو تسلی دینے لگی خواجہ سر اسٹے پھر کہا چلو بس ہو چکا جلد ہی چلو۔ ناز بانو کا مزاج تیز تھا۔ وہ نو کروں کو ہمیشہ سخت سست کہہ لیا کرتی تھی اور یہ لوگ دم بخود ہو کر سُن لیتے تھے۔

اسی خیال سے اُس نے خواجہ سر کو پھر دو ایک باتیں سنا دیں۔ کبخت کو سننے ہی اتنا خفتہ آیا کہ آپے سے باہر ہو گیا اور بڑی بے ترسی سے بن ماں باپ کی دکھیاچی کے ایک طمانچہ مارا۔ بانو بلبلا گئی۔ وہ کبھی پھول کی جھڑی سے بھی نہ پٹی تھی یا ایسا طمانچہ لگا۔ اس کے رونے سے مجھ کو بھی بے اختیار رونا آ گیا ہم تو رونے رہے اور خواجہ سر ا کہیں چلا گیا۔ پھر خبر نہ ملی کہ وہ کیا ہوا۔ ہم دونوں بمشکل تمام کرتے پڑتے درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء میں پہنچے۔ یہاں دہلی کے اور خاص ہمارے خاندان سینکڑوں آدمی تھے مگر ہر ایک اپنی اپنی مصیبت میں گرفتار قیامت کا منہ دیکھتا کسی نے بات تک نہ پوچھی۔ اسی اثنا میں وہاں پھیلی اور پیاری بہن ناز بانو اس میں رخصت ہو گئیں میں اکیلی رہ گئی۔ امن ہوا جب بھی مجھ دکھیا کو سکھ نہ ملا آخر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ انگریزی سرکار نے ہم لوگوں کی پرورش کرنی چاہی اور میرا پانچ روپیہ عینہ وظیفہ مقرر ہوا جو اب بھی ملتا ہے۔

پانچواں فسانہ

دہلوی تاجدار کے ایک کنبہ کا فسانہ

جب دہلی زندہ تھی اور ہندوستان کے دل کہلانے کا حق کرتی تھی لال قلعہ بڑھاپا

کا آخری نشان لہرا رہا تھا۔ اُنھیں دنوں کا ذکر ہے کہ مرزا سلیم بہادر اور اجوا بظہر بہادر شاہ کے بھائی تھے اور غدر سے پہلے ایک اتفاقی قصور کے سبب قید ہو کر الٹے کوچے گئے تھے اپنے مردانہ مکان میں بیٹھے ہوئے دوستوں سے بے تکلفانہ باتیں کر رہے تھے کہ تنے میں زمان خانہ سے ایک لوٹری باہر آئی اور ادب سے عرض کیا کہ حضور سلیم صاحبہ یاد فرماتی ہیں۔ میرزا سلیم فوراً محل میں چلے گئے۔ اور تھوڑی دیر میں منوم واپس آئے ایک بے تکلف ندیم نے عرض کیا۔

”خیر باشد مزاج عالی مکر پاتا ہوں“ مرزا نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”نہیں کچھ نہیں بعض اوقات اماں حضرت خواہ مخواہ ناراض ہو جاتی ہیں۔ کل شام کو افطاری کی کیفیت متعین خاں گویا کچھ گارہا تھا اور میرادل ہسلارہا تھا۔ اُس وقت اماں حضرت قرآن شریف پڑھا کر رہی تھیں انکو یہ شور و غل ناگوار معلوم ہوا۔ آج ارشاد ہوا ہے کہ رمضان گانے بجانے کی محفلیں بند کر دی جائیں۔ بھلا میں اس تفریح کی عادت کو کیونکر چھوڑ سکتا ہوں ادب کے لحاظ سے قبول تو کر لیا مگر اس پابندی سے جی اُجھتا ہے حیرت ہوں کہ یہ سولہ دن کیونکر بسر ہوں گے۔“

مصاحب نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا حضور یہ بھی کوئی پریشان ہونے کی بات تو شام کو افطاری سے پہلے جامع مسجد شریف لے چلا کیجئے عجب بہار ہوئی ہے رنگیں برنگ کے آدمی طرح طرح کے چٹکھٹے دیکھنے میں آئیں گے۔ خدا کے دن ہی خدا اور کی بہار بھی دیکھئے۔

مرزا نے اس صلاح کو پسند کیا اور دوسرے دن مساجدوں کو لیکر جامع مسجد چنیچے وہاں جا کر عجب عالم دیکھا۔ جگہ جگہ حلقہ بنائے لوگ بیٹھے ہیں کہیں ان بیٹوں کے دور ہو رہے ہیں۔ رات کے قرآن سننے والے حفاظ ایک دوسرے کو قرآن شمار رہے ہیں کہیں سائل دین پر گفتگو ہو رہی ہے۔ دو عالم کسی فقہی مسئلہ پر بحث کرتے ہیں

اور بیسیوں آدمی گرد میں بیٹھے مزے سے سن رہے ہیں کسی جگہ توجہ اور مراقبہ کا حلقہ ہے کہیں کوئی صاحبِ ظائف میں مشغول ہیں الغرض سب میں چاروں طرف اللہ الودیع ہوتا ہے کلّ جَدِید کَذِیْدًا۔ مرزا کو یہ نظارہ بہت پسند آیا اور وقت بہت لطف سے کٹ گیا۔ اتنے میں افطار کا وقت قریب آیا سینکڑوں خوں فطاری کے آنے لگے اور لوگوں میں فطاریاں تقسیم ہونے لگیں۔ خاص محلِ سلطانی سے متعدد خواں بکلف چیزوں سے آراستہ روزانہ جامع مسجد میں بھیجے جاتے تھے۔ تاکہ روزداروں میں فطاری تقسیم کی جائے اسکے علاوہ قلعہ کی تمام بیگمات اور شہر کے سب امرا علیحدہ افطاری کے سالن بھیجتے تھے اسلئے ان خوں کی گنتی سینکڑوں تک پہنچ جاتی تھی۔ چونکہ ہر امیر کو شش کرتا تھا کہ اسکا سالانہ افطاری وہ سال سے بڑھ کر ہے اسلئے ریشمی رنگ برنگ کے خوں پوش اور ان پر مقیشی جھالیں ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر ہوتی تھیں اور مسجد میں ان کی عجیب رائش ہو جاتی تھی۔

میرزا کے دل پر اس دینی چرچے اور شان و شوکت نے بڑا اثر ڈالا۔ اور اب وہ برابر روزانہ مسجد میں آنے لگے۔ گھر میں وہ دیکھتے کہ سینکڑوں فقراء کو سحری ادا کر ڈیٹا کا کھانا روزانہ شہر کی خانقاہوں اور مسجدوں میں بھجوا یا جاتا تھا اور باوجود رات دن کہ لہو و لوب کے یہ دن ان کے گھر میں بڑی برکت اور چل بہل کے معلوم ہوتے تھے۔ مرزا سلیم کے ایک بھانجے مرزا شہ زور نو عمری کے سبب کثر اپنے ماموں کی صحبت میں بے تکلف شریک ہو کرتے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ ایک تو وہ وقت تھا جو آج خوابے خیال کی طرح یاد آتا ہے اور ایک وہ وقت آیا کہ دہلی زیرِ روز بر ہو گئی۔ قلعہ برباد کر دیا گیا امیروں کو پھانسیاں مل گئیں ان کے گھر اکھڑ گئے ان کی بیگمات ماما گیری کرنے لگیں اور سلطانوں کی سب شان و شوکت تاراج ہو گئی۔ اس کے بعد ایک دفعہ رمضان شریف کے مہینے میں ایک جانیر کا اتفاق ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ جگہ جگہ چولے بنے ہوئے ہیں سپاہی روٹیاں بکارتے ہیں گھوڑوں کے دانے دے جا رہے ہیں گھاناس کے انبار لگے ہوئے ہیں اور شاہجہان کی خوبصورت

اور بے مثل مسجدِ صہبیل نظر آتی ہے اور پھر جب مسجدِ داکڑا داشت ہو گئی اور سرکار نے اس کو مسلمانوں کے حوالے کر دیا تو رمضان ہی کے چہینے میں پھر جانا ہوا۔ دیکھا چند سلطان بیسے کچیلے پوند لگے کپڑے پہنے بیٹھے ہیں دو چار قرآن شریف کا دور کر رہے ہیں۔ اور کچھ اسی پریشان حالی میں بیٹھے وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ افطاری کے وقت چند آدمیوں نے کھجوریں در دال سیو بانٹ دیے کسی نے ترکاری کے قتلے تقسیم کر دیئے۔ نہ وہ اگلا سماں نہ وہ اگلی سی چہل پہل۔ نہ وہ پہلی سی شان و شوکت۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ بچارے فلک کے مارے چند لوگ جمع ہو گئے ہیں۔

اس کے بعد آجکل کا زمانہ بھی دیکھا جبکہ مسلمان چاروں طرف سے دب گئے ہیں انگریزی تعلیم یافتہ مسلمان تو مسجد میں نظر ہی کم آتے ہیں۔ غریب غریبا، اُسے تو ان سے رونق کیا خاک ہو سکتی ہے۔ پھر بھی غنیمت ہے کہ مسجد آباد ہے اگر مسلمانوں کے اخلاص کا یہی عالم رہا تو تیز ہجر نہیں کیا نوبت آئے۔

مرزا شہ زور کی باتوں میں بڑا درد اور اثر تھا۔ ایک دن میں نے ان سے عذر کا قصہ اور تباہی کا فسانہ سُنا چاہا۔ آنکھوں میں آنسو بھلائے اس کے بیان کرنے میں عذر و مجبوری ظاہر کرنے لگے لیکن جب مینے زیادہ اصرار کیا تو اپنی دردناک کہانی اس طرح سنائی۔

”جب انگریزی توپوں نے کرچوں اور سنگینوں لے چکنا تو بھوڑے ہمارے ہاتھ سے تلوہ چھین لی۔ تلخ سر سے اُتار لیا۔ تخت پر قبضہ کر لیا۔ شہر میں آتشاک گولیوں کا مینہ برس چکا۔ سات پردوں میں رہنے والیاں بے چادہ ہو کر بازار میں اپنے وارثوں کی بڑبڑتی لاشوں کو دیکھنے لگی تھیں۔ چھوٹے بن باپ کے بچے آبا آبا بھارتے ہوئے بے یار و مگر پھرنے لگے۔ حضورِ ظلِ سبحانی جن پر ہم سب کا سہارا تھا قلعہ چھوڑ کر باہر نکل گئے اُس وقت میں نے بھی اپنی بوڑھی والدہ کسین بہن اور حاملہ بیوی کو ساتھ لیکر لیورا جڑے قافلہ کھلائے۔ بس کر گھر سے کوچ کیا۔

ہم لوگ دوروتوں میں سوار تھے۔ سید سے غازی آباد کا رخ کیا مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ راستہ انگریزی لشکر کی جولاٹھا بنا ہوا ہے۔ اس لئے شاہدہ سے واپس ہو کر قطب صاحب چلے اور وہاں پہنچ کر رات کو آرام کیا۔ اس کے بعد صبح آگے روانہ ہوئے۔ چتر پور کے قریب گوجروں نے حملہ کیا اور سب مان لوٹ لیا مگر اتنی ہربانی کی کہ ہکوزندہ چھوڑ دیا۔ وہ قتل جنگل۔ تین عورتوں کا ساتھ اور عورتیں بھی کسی ایک بڑھا بے سے لاچار۔ دو قدم چلنا دشوار دوسری حاملہ اور بیمار تیسری دس برس کی معصوم لڑکی زار و نزار عورتیں روتی تھیں اور بیان کر کے کہ روتی تھیں۔ میرا کلیجہ ان کے بیان سے پھٹا جاتا تھا۔ والدہ کہتی تھیں اہی ہم کہاں جائیں کہ ساہارا ڈھونڈیں ہمارا تاج و تخت لٹ گیا۔ تو ٹوٹا بوریہ اور امن کی جگہ تو دے اس بیمار پیٹ والی کو کہاں لیکر بیٹھوں۔ اس معصوم بچی کو کس کے حوالے کر دو جنگل کے درخت بھی ہمارے دشمن ہیں کہیں سایہ نظر نہیں آتا۔ بہن کی یہ کیفیت مٹی کہ وہ سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ اور ہم سب کا منہ تکی تھی مجھ کو اسکی معصومانہ بیکی پر بڑا ترس آتا تھا آخر غم جو میں نے عورتوں کو دلاسا دیا اور آگے چلنے کی ہمت بندھائی۔ گاؤں سامنے نظر آتا تھا غریب عورتوں نے چلنا شروع کیا۔ والدہ صاحبہ قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی تھیں اور سر پر ہاتھ بیٹھ جاتی تھیں اور جب وہ یہ کہتیں۔

تھوڑا لگوٹھو کر بس کھلوانی ہے جو تاجو رونکے ٹھوکریں مارتے تھے قسمت نے انکو بے بس کر دیا جو بیکونکے کام آتے تھے ہم جنگل کی کنسل میں کئی تلوار سے زمین کا پتی مٹی ہم تیمور کی اولاد ہیں جو ملکونکا اور شہریار و نکشاہ تھا۔ ہم شاہجہاں کے گھر والے ہیں جس نے ایک قبر پر جو اہر نگار بہار و کھادی اور دنیا میں ظہیر مسجد دہلی کے اندر بنا دی۔ ہم سندوستان کے شہنشاہ کے کہنے میں ہیں ہم عورت والے تھے زمین میں ہیں کیوں ٹھکانا نہیں ملتا وہ کیوں سرکشی کرتی ہے

آج ہمیں صیبت ہے آج ہم پر آسمان روتا ہے

تو بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ الفصہ ہزار وقت و دشواری گرتے پڑتے گاؤں میں پہنچے۔ یہ گاؤں مسلمان بیواتیوں کا تھا انھوں نے ہماری خاطر کی اور اپنی جو باتیں کہیں سہرا دی۔ کچھ روز تو ان مسلمان گنواروں نے ہمارے کھلے پینے کی خبر رکھی اور چوباز میں ہکو کھڑے رکھا۔ لیکن کب تک یہ بار اٹھا سکتے تھے اکتا گئے اور ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ میاں جی چو پاڑ میں ایک برات آئے والی ہے۔ تو دوسرے چھپر میں چلا جا اور رات دن ٹھالی دیکھا۔ بیٹھے کیا کرے ہے کچھ کام کیوں نہیں کرتا۔ میں نے کہا: ”بھائی جہاں تم کہو وہیں جا بیٹھو، ہمیں چو پاڑ میں رہنے کی ہوس نہیں ہے۔ جب فلک نے عالیشان محل میں لئے تو اس پتے مکان پر ہم کیا ضد کرینگے۔ اور رہی کام کرنے کی بات سو میل جی تو خود گھبراتا ہے خالی بیٹھے بیٹھے طبیعت اکتائی جاتی ہے۔ مجھ کو کوئی کام بتاؤ ہو سکے گا تو آنکھوں سے کروں گا۔ ان کا چو دھری بولا۔ ہم نے کے بیر (ہمیں کیا خبر کہ تو کے کام کیا کام) کر کے ہے۔ میں نے جواب دیا میں سپاہی زادہ تیغ تفنگ چلانا میرا ہنر ہے اس کے علاوہ اور کوئی کام نہیں جانتا۔ گنوار سنیں کر کہنے لگے: ”نہ بابا یہاں تو ہل چلانا ہو گا۔ گھاس کھو دنی بڑی ہم نے تلوار کے ہنر کیا کرنے ہیں؟ گنواروں کے اس جواب سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور جواب دیا کہ میاں جو مجھ کو تو ہل چلانا اور گھاس کھوئی نہیں آتی۔ مجھ کو روتا دیکھ کر گنواروں کو رحم آ گیا اور بولے ”اچھا تو ہمارے کھیت کی رکھو لی کیا کر اور تیری عورتیں ہمارے گاؤں کے کپڑے سی دیا کر بن فصل پر تجھ کو اندھ دیدیا کریں گے جو تجھ کو برس دن کافی ہو گا۔ چنانچہ یہی ہو کہ میں سارا دن کھیت پر جا دوڑاٹایا کرتا تھا اور گھر میں عورتیں کپڑے سینتی تھیں۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ مبادوں کا مہینہ آیا اور گاؤں میں سب کو بخار آئے لگامیری اٹلیا و رہن کو بھی بخار نے آن دیا۔ وہ گاؤں وہاں دو اور حکیم کا کیا ذکر خود لوٹ پٹنکر ایچے ہو جاتے ہیں۔ مگر یہو دو اؤں کی عادت تھی سخت تکلیف اٹھانی پڑی۔ اسی حالت میں ایک دن اس زور کی بارش ہوئی کہ جنگل کا نالہ چڑھ آیا اور گاؤں میں مکر مکر پانی ہو گیا

گھاؤں والے تو اس کے عادی تھے لیکن ہماری حالت اس طوفان کے سبب مرنے سے بدتر ہو گئی۔ چونکہ پانی ایک دفعہ ہی رات کے وقت گھس آیا تھا اسلئے ہماری عورتوں کی چار پائیاں بالکل غرق آب ہو گئیں اور عورتیں جنہیں مارنے لگیں آخر بڑی شکل سے چھپر کی بیلیوں میں دو چار پائیاں ڈاکر عورتوں کو ان پر بٹھایا۔ پانی گھنٹہ بھر میں اتر گیا۔ مگر غصہ بت ہوا کہ کھلنے کا انداز اور اڑتے بچھانے کے کپڑے تر کر گیا۔ پچھلی رات میری بیوی کے دردزہ شروع ہوا اور ساتھ ہی جاڑے سے بخار بھی آیا اس وقت کی پریشانی بس بیان کرنے کے قابل نہیں ندیر گھٹ مینہ کی جھڑی کپڑے سب گیلے آگ کا سامان ناممکن حیران تھے ابھی کیا انتظام کیا جائے۔ درد بڑھنا شروع ہوا اور مریضہ کی حالت نہایت بدتر ہو گئی یہاں تک کہ تڑپے لگی اور تڑپتے تڑپتے جان دیدی بچہ پیٹ ہی میں رہا۔

چونکہ وہ ساری عمر ناز و نعمت میں پلی تھیں قدر کی مصیبتیں ہی انکی ہلاکت کے لئے کافی تھیں خیر اس وقت تو جان بچ گئی مگر یہ بعد کا جھٹکا ایسا بڑا لگا کہ جان لیکر گیا۔ صبح ہو گئی گاؤں والوں کو خبر ہوئی تو انھوں نے کفن وغیرہ منگوادیا اور دوپہر تک یہ محتاج شہزادی گورخیاں میں ہمیشہ کے لئے جاسوئی۔

اب ہلو کھانے کی فکر ہوئی کیونکہ آناج سب بھیک کر ستر گیا تھا گاؤں والوں سے بھی مانگے نہ ہوئے سحفاظا تھا وہ بھی ہماری طرح اسی مصیبت میں گرفتار تھے۔

ہم چار گاؤں کے چودہری کو خود ہی خیال ہوا اور اس نے قطب صاحب سے ایک دو پیچہ آٹا منگوادیا وہ آٹا نصف کے قریب خرچ ہوا ہوگا کہ رمضان شریف کا چاند نظر آیا والدہ صاحبہ کا دل بہت نازک مقامہ ہر وقت گزشتہ زمانہ کو یاد کیا کرتی تھیں رمضان کا چاند دیکھ کر انھوں نے ایک ٹھنڈا سانس بھر اور چپ ہو گئیں میں سمجھ گیا کہ ابی کو اگلا وقت یاد آ گیا ہے تسلی کی باتیں کرنے لگا جس سے اُنکو کچھ ڈھارس ہو گئی۔

چار پانچ دن تو آرام سے گزر گئے مگر جب آناختم ہو چکا تو بڑی مشکل درپیش ہوئی سوا

کہتے ہوئے شرم آتی تھی۔ اور پاس ایک کوڑی نہ تھی۔ شام کو پانی سے روزہ کھولا بھوکے مارے کلیچہ بندہ کو آتا تھا۔

والدہ صاحبہ کی عادت تھی کہ اس قسم کی تکلیف کے وقت بیان کر کے رویا کرتی تھیں مگر آج وہ بڑے اطمینان سے خاموش تھیں۔ انکی خاموشی و اطمینان سے میرے دل کو بھی سہارا ہوا اور چھوٹی بہن کو جس کے چہرے پر بھوک کے مارے ہوئیاں اڑ رہی تھیں دلاسا دینے لگا وہ معصوم بھی میرے سمجھانے سے نڈھال ہو کر چار پانی پر جا پڑی اور تھوڑی دیر میں سو گئی۔ بھوک میں نیند کہاں آتی ہے بل یک غوطہ سا تھا۔

اس غوطہ اور ناتوانی کی حالت میں سحری کا وقت آگیا والدہ صاحبہ اٹھیں اور تہجد کی نماز کے بعد جن دردناک الفاظ میں انھوں نے دعا مانگی انکا نقل کرنا محال ہے محال مطلب یہ ہے کہ انھوں نے بارگاہ الہی میں عرض کیا کہ

بھئیایا کیا تھا کیا ہوئی کجی نہ لایا ہی ہو رمضان کا مہینہ میں کچھ گھر کو سینکڑوں محتاجوں کا کھانا ملتا تھا اور کچھ خود ملنے والے کو محتاج ہیں در روزہ پر روزہ رکھے ہیں خداوند اگر مجھے قصور ہوا تو اس معصوم بچی نے کیا خطا کی جس کے ثمنہ میں کل سو ایک کھیل لڑکے نہیں گئی؟

دوسرا دن بھی یونہی گزر گیا اور فاقہ میں روزہ پر روزہ رکھا شام کے قریب چودہری کا آدمی دودھ اور میٹھے چاول لایا اور بولا آج ہمارے نیاز تھی یہ اس کا کھانا ہو اور پانچ روپیہ زکوٰۃ کے ہیں ہر سال بکریوں کی زکوٰۃ میں بکری دیا کرتے ہیں گراب کا نقد دیدیا۔ یہ کھانا اور روپیہ مجھ کو ایسی نعمت معلوم ہوئے گویا بادشاہت مل گئی۔ خوشی خوشی والدہ کے آگے سارا قصہ کہا۔ کہتا جاتا تھا اور خدا کا شکر ادا بھیجتا جاتا تھا مگر یہ خبر نہ تھی کہ گردشِ فلاکت نے مر دے خیال پر تو اثر ڈال دیا لیکن عورت ذات جوں کی توں اپنی تہی غیرت دہری پر قائم ہے۔

چنانچہ میں نے دیکھا کہ والدہ کا رنگ تغیر ہو گیا۔ باوجود فاقہ کی ناتوانی کے انھوں نے

یہ تو بدل کر کہا: "تف ہے تیری غیرت پر خیرات اور نکلہ لیکر آیا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ اس سے مرعہ نامہتر تھا اگرچہ ہم مٹ گئے مگر ہماری حرارت نہیں مٹی۔ میدان میں نکل کر مرجانا یا مار ڈالنا اور تلوار کے زور سے روٹی لینا ہمارا کام ہے۔ صدقہ خواری ہمارا مشیوہ نہیں۔"

والدہ کی ان باتوں سے مجھے پسینہ آگیا اور قسم کے مارے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے چاہا کہ اٹھ کر یہ چیزیں واپس کر آؤں مگر والدہ نے روکا اور کہا: "خدا ہی کو یہ منظور ہے تو ہم کیسا کریں سب کچھ سہنا کر بیٹا گیا۔ یہ کہہ کر کھانا رکھ لیا اور روزہ کھولنے کے بعد ہم سب مل کر کھا لیا پانچ روپیہ کا آٹا منگوا یا گیا جس سے رمضان خیر و خوبی سے بسر ہو گیا۔"

اس کے بعد چھ مہینے گاؤں میں اور رہے پھر دہلی چلے آئے۔ یہاں آکر والدہ کا تو انتقال ہو گیا اور بہن کی شادی کر دی۔ انگریزی سرکار نے میری بھی پانچ روپیہ ماہوار پنشن مقرر کر دی ہے جس پر کل زندگی کا انحصار ہے۔

چھٹا فسانہ بنت بہادر شاہ

یہ ایک بیچاری درویشی کی سچی بیبتا ہے۔ جو زمانہ کی گردش سے ان پر گزری ان کا نام کلثوم زمانی بیگم تھا یہ دہلی کے آخری مغل بادشاہ ابوظفر بہادر شاہ کی لاڈلی بیٹی تھیں، چند سال ہوئے ان کا انتقال ہو گیا۔ میں نے بارہا شہزادی صاحبہ سے خود ان کی زبانی ان کے حالات سنے ہیں۔ کیونکہ ان کو ہمارے حضور خواجہ نظام الدین علیا محبوب الہی کی خانقاہ سے خاص عقیدہ تھی۔ اس لئے اکثر حاضر ہوتی تھیں۔ اور محکومانہ

دردناک باتیں سننے کا موقع ملنا تھا۔ نیچے جب قدر واقعات لکھے گئے ہیں وہ یا تو خود ان کے بیان کردہ ہیں یا انکی صاحبزادی زینت زمانی بیگم کے جواب تک زندہ ہیں اور پنڈت کے کوچہ میں رہتی ہیں اور وہ حالات یہ ہیں۔

جس وقت میرے بابا جان کی بادشاہت ختم ہوئی اور تاج و تخت لئے حکومت قریب آیا تو دلی کے لالچہ میں ایک کھرام چلا ہوا تھا درو دیوار پر حسرت برسی تھی اُجلے اُجلے سنگ مرمر کے مکان کا لے سیاہ نظر آتے تھے۔ تین دقت سے کسی نے کچھ نہ کھایا تھا زینت میری گودیوں ڈیڑ برس کا بچہ تھی اور دودھ کے لئے ہلکتی تھی۔ فکر اور پریشانی کے مارے نہ میرے دودھ رہا تھا نہ کسی آٹا کے ہم سب اسی یاس و ہراس کے عالم میں بیٹھے تھے کہ حضرت نعل سبحانی کا خاص خواجہ سرسبکو بلا لے آیا آدھی رات کا دقت سنائے کا عالم گویوں کی گرج سے دل بہہ جاتے تھے لیکن حکم سلطانی ملتے ہی حاضری کے لئے روانہ ہو گئے حضور مصطفیٰ پر تشریف رکھتے تھے شیعہ ہاتھ میں تھی جب میں سامنے پہنچی جھک کر میں مجھے بجالالی حضور نے ہنایت شفقت سے قریب بلایا اور فرمائے لگے یہ کلنوم اب تم کو خدا کو سونپا قسمت میں ہے تو پھر دیکھ لیں گے تم اپنے خاوند کو لیکر فوراً کہیں چلی جاؤ میں بھی جاتا ہوں۔ جی تو نہیں چاہتا کہ اس آخری وقت میں تم بچوں کو آنکھ سے اوجھل ہونے دوں پر کیا کروں ساتھ رکھنے میں تمہاری بربادی کا اندیشہ ہے الگ رہو گی تو شاید خدا کوئی بہتری کا سامان پیدا کر دے۔

اتنا فرما کر حضور نے دست مبارک دعا کے لئے بلند کئے جو عرش کے سبب کانپ رہے تھے دیر تک آواز سے بارگاہِ آہی میں عرض کرتے رہے۔

خداوند ایہ بے وارث بچے تیرے حوالے کرتا ہوں یہ محلوں کے رہنے والے جھل ویرانوں میں جاتے ہیں دنیا میں ان کا کوئی یار و مددگار نہیں ہاں تیمور کے نام کی عزت رکھیو اور ان سبکیں عورتوں کی آبرو بچاؤ پروردگار بھی نہیں


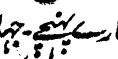
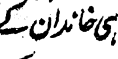
بلکہ ہندوستان کے سب ہندو مسلمان میری اور آجکل سب
مصیبت چھانی ہے میرے اعمال کی شامت سے انکو سزا دے کر اور سبکو
پریشانیوں سے نجات دے۔

اس کے بعد میرے سر پر ہاتھ رکھا زینت کو ہار کیا اور میرے خاوند مرزا نصیر الدین
کو کچھ جواہرات عنایت کر کے نور محل صاحبہ کو بھی ہمراہ کر دیا جو حضور کی حکمت تھیں۔

پہلی رات کو ہمارا قافلہ قلعہ سے نکلا جس میں دو مرد اور تین عورتیں تھیں مردوں
میں ایک میرے خاوند میرزا نصیر الدین اور دوسرے مرزا عمر سلطان بادشاہ کے
بہنوئی تھے عورتوں میں ایک میں دوسری نواب نور محل تیسری حافظ سلطان بادشاہ
کی سمہن تھیں جو قوت ہم لوگ رتھ میں سوار ہونے لگے۔ صبح صادق کا وقت تھا
تارے سب چھپ گئے تھے مگر فجر کا تارا جھللا رہا تھا ہم نے اپنے بھرے ہوئے
پراور سلطان محلوں پر آخری نظر ڈالی تو دل بھر آیا اور آسوا منڈنے لگے۔ نواب نور محل
کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور پلکیں ان کے بوجھ سے کانپ ہی تھیں وہ
صبح کے تارے کا جھللا نا نور محل کی آنکھوں میں نظر آتا تھا۔

آخر لال قلعہ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو کر کورالی گاؤں میں پہنچے اور وہاں اپنے
رتھ بان کے مکان پر قیام کیا۔ باہر بیٹا اور چھاچھ کھانے کو میسر آئی تھی
بھوک میں یہ چیزیں بریانی تلخ سے زیادہ معلوم ہوئیں ایک دن رات
تو امن سے بسر ہوا مگر دوسرے دن گرد و نواح کے جاٹ گوجر جمع ہو کر کورالی کو
لوٹنے چڑھ آئے۔ سینکڑوں عورتیں بھی ان کے ساتھ تھیں جو چڑیوں کی طرح
ہم لوگوں کو چپٹ گئیں۔ تمام زیور اور کپڑے ان لوگوں نے اتار لئے جو قوت
پر سڑی بٹی عورتیں اپنے موٹے موٹے میلے ہاتھوں سے ہمارے گلے کو نوچتی تھیں
تو ان کے ہانگوں سے ایسی بو آتی تھی کہ دم گھٹنے لگتا تھا۔

اس لوٹ کے بعد ہمارے پاس اتنا بھی باقی نہ رہا جو ایک وقت کی روٹی کو کافی ہو سکتا۔ حیران تھے کہ دیکھئے اب اور کیا پیش آئیگا۔ زینت پیاس کے ماری رو رہی تھی۔ سامنے سے ایک میندار نکلا میں نے بے اختیار ہو کر آواز دی۔ بھائی تھوڑا پانی اس بچی کو لادے۔ زمیندار فوراً ایک مٹی کے برتن میں پانی لایا اور بولا آج سے تو میری بہن اور میں تیرا بھائی۔ یہ زمیندار کو رالی کا کھانا پیتا آدمی تھا اسکا نام سببی تھا اسنے اپنی بیل گاڑی تیار کر کے سکو سوار کیا اور پوچھا کہ جہاں تم کہو پہنچا دوں جتنے کہا کہ اجاڑہ ضلع میرٹھ میں میر فیض علی شاہی حکیم رہتے ہیں جن سے ہمارے خاندان کے خاص مراسم ہیں وہاں لے چل بستی سکو اجاڑہ لے گیا۔ مگر میر فیض علی نے ایسی بے مروتی کا برتاؤ کیا جسکی کوئی حد نہیں صاف کانوں پر ہاتھ رکھ لئے کہ میں تم کو گوشت ٹھیکر کر اپنا گھر بھرتا ہوں کرنا نہیں چاہتا۔

وہ وقت بڑا باہوسی کا تھا۔ ایک تو خطرہ کہ پیچھے سے انگریزی فوج آتی ہو گی اس پر بے سرو سامانی کا یہ عالم کہ ہر شخص کی نگاہ پھری ہوئی تھی۔ وہ لوگ جو ہماری آنکھوں کے اشاروں پر چلتے اور تہہ زدن دیکھتے رہتے تھے کہ ہم جو کچھ حکم دیں پورا کیا جائے وہی آج ہماری صورت سے بیزار تھے۔ شاہی بستی زمیندار کو کہ اس نے زبانی بہن کہنے کو آخر تک نہ ہا اور ہمارا  والا چاراجاڑہ سے روانہ ہو کر  آما دیکھا۔ عورتیں بستی کی  وار تھیں اور مرد پیدل چل رہے تھے تیسرے روز ایک ندی کے کنارے پہنچے۔ جہاں کوئل کے نواب کی فوج بڑی ہوئی تھی۔ انھوں نے جو سنا کہ ہم شاہی خاندان کے آدمی ہیں تو بڑی خاطر کی اور ہاتھی پر سوار کر کے ندی سے پار اُتارا۔ ابھی ہم ندی کے پار اُترے ہی تھے کہ سامنے سو لکیر کی فوج آگئی اور نواب کی فوج سے لڑائی ہونے لگی۔

میرے خاوند اور مرزا عمر سلطان نے چاہا کہ نواب کی فوج میں شامل ہو کر لڑیں

مگر رسالہ دار نے کہلا بھیجا کہ آپ عورتوں کو لیکر جلدی چلے جائیے ہم جیسا موقع ہوگا بھگت لیں گے سامنے کھیت تھے جن میں بٹی ہوئی تیار کھیتی کھڑی تھی لوگ اسکے اندر جمپ گئے ظالموں نے خبر نہیں کچھ لیا تھا یا ناگھائی طور پر گولی لگی جو کچھ بھی ہوا ایک گولی کھیت میں آئی جس سے آگ بھڑک اٹھی اور نام کھیت جلنے لگا ہلوگ وہاں سے نکل کر بھاگے۔ پر ہائے کیسی مصیبت تھی ہلو بھاگنا بھی نہ آتا تھا گاہاں میں کچھ کچھ کر گرتے تھے سر کی چادریں وہیں رہ گئیں برہنہ سر جو اس باختمہ بنوار وقت سے کھیت کے باہر آئے میرے اور نواب نور محل کے پاؤں خرم خون ہو گئے پیاس کے مارے زبا میں باہر نکل آئیں۔ زینت پر غشی کا عالم تھا۔ مرد ہلو سنبھالنے تھے مگر ہمارا سنبھالنا مشکل تھا۔

نواب نور محل تو کھیت سے نکلتے ہی چکر کر گر پڑیں۔ اور بیوش ہو گئیں۔ میں نے کھیت سے چھاتی سے لگائے اپنے خاوند کا منہ تک رہی تھی اور دل میں کہتا تھا کہ آہی ہم کہاں جائیں کہیں ہمارا نظر نہیں آتا۔ قسمت ایسی پٹی کہ شاہی سے گمراہی ہو گئی لیکن فیصلہ کو جین و اطمینان ہوتا ہے۔ یہاں وہ بھی نصیب نہیں۔

فوج لڑتی ہوئی دوڑ نکل گئی۔ قریبی سے پانی لایا۔ ہم نے پیا۔ اور آدھ نور محل کے چہرہ پر چھڑکا۔ نور محل۔ ابھی خواب میں ملتا ہے بابا جان حضرت ظل سبحانی کو دیکھا ہے۔ کوس و زنجیر پہنے ہوئے کھڑے ہیں اور کہتے ہیں آج ہم غریبوں کیلئے یہ کاتوں بھرا خاک کا کچھ نافرین محکمہ ہے۔ بڑے بڑے نور محل گھبراہٹ سے کام لیتا تقدیر میں لکھا تھا کہ بڑا پیس میں یہ تھا بیان برداشت کروں ورامیری کا کٹوم کو دکھا دو جیلنا نے جانے سے بچا اسکو دیکھو گھا۔ بادشاہ کی یہ باتیں سنکر میں نے ہائے کا نعرہ مارا اور آنکھ کھلی گئی۔ کٹوم کیا سرخ ہمارے بادشاہ کو زنجیروں میں جکڑا ہو گا۔ کیا واقعی وہ قیدوار نہ کہ طرح جیلخانے میں ہے

ہونگے۔ مرزا عمر سلطان نے اسکا جواب دیا کہ خواب و خیال ہے بادشاہ لوگ بادشاہوں کے ساتھ ایسی بدسلوکیاں نہیں کیا کرتے۔ تم گھبراؤ نہیں وہ اچھے حال میں ہونگے۔ فقط سلطان بادشاہ کی سمدھن بولیں۔ یہ سوئے فرنگی بادشاہوں کی قدر کیا خاک جانیں گے خود اپنے بادشاہ کا سر کاٹ کر سولہ آئے کو بھیجے ہیں۔ بوانور محل تم نے تو طوق اور زنجیر پہنے دکھا ہے میں کہتی ہوں کہ بیٹے بقاولوں سے تو اس سے زیادہ بدسلوکی دور نہیں ہے۔ مگر میرے شوہر میرزا ضیاء الدین نے تسکین و دلا سے کی باتیں کر کے سب کو مطمئن کر دیا میں بتی ناؤ میں گاڑی کو اس پار لے آیا۔ اور ہم سوار ہو کر روانہ ہوئے۔ تھوڑی دو جا کر شام ہو گئی اور ہماری گاڑی ایک گاؤں میں جا کر ٹھہری جس میں مسلمان راجپوتوں کی آبادی تھی۔ گاؤں کے منبر دار نے ایک چھپرہ ہمارے واسطے خالی کرادیا جس میں کئی گھاس اور پھوس کا بھجونا تھا۔ وہ لوگ اسی گھاس پر جب کو پیال یا پرال کہتے تھے بیٹے ہیں۔ ہکو بھی بڑی خاطر داری سے جو انکے خیال میں بڑی خاطر تھی، یہ نرم بھوناد گیا۔ میرا تو ابن کوڑے سے جی اکھنے لگا پر کیا کرتے اس وقت سوائے اسکے اور کیا ہو سکتا تھا نا چاراسی میں بڑ رہے۔ دن بھر کی تکلیف اور تکان کے بعد اطمینان اور بے فکری میں سوتی تھی نیند آ گئی۔ آدھی رات کو اچانک اس کی آنکھ کھل گئی گھاس کے تنکے سوپوں کی طرح بدن میں چب رہے تھے اور سوچ رہے تھے۔ اس وقت کی ہیکلی بھی خدا کی بجاہ پسوؤں نے تمام بدن میں آگ لگا دی تھی۔ غلی ٹکیوں۔ ریشمی نرم نرم بھونوں کی مٹو تھی میں نے تکلیف ہوئی ورنہ ہم ہی جیسے وہ گاؤں کے آدمی بھی تھے جو بے غرض اسی گھاس پر رہتے سوتے تھے اندھیری رات میں چاروں طرف گیدڑوں کی آوازیں آرہی تھیں اور ہر اول سہا جاتا تھا قسمت کو پلٹے در نہیں لگتی کون کہہ سکتا تھا کہ ایک دن خرمشاہد کے بال بچے توں خاک پر بسرے لیتے پھر تنکے قصہ مختصر اسی طرح منزل منزل تقدیر کی گردنوں کا نشانہ دیکھتے ہوئے حیدر آباد پہنچے اور ستارام پیٹھ میں ایک مکان کرایہ لیکر

ٹھہرے جبل پور میں میرے شوہر نے ایک جڑاؤ لگوئی جو لوٹ کھسوٹ لگ گئی تھی فروخت کی اسی میں راستہ کا خرچ چلا اور چند روز یہاں بھی بسر ہوئے آخر تباہ کے جو کچھ تھا ختم ہو گیا اب فکر ہوئی کہ پیٹ بھرنے کا کیا حیلہ کیا جائے میرے شوہر علی درجہ کے خوشنویس تھے۔ انھوں نے درود شریف خطریاں میں لکھا اور چار مینار پر ہدیہ کرنے لگے گو لوگ اس خط کو دیکھتے تھے اور حیرت میں رہتے تھے۔ اول روز پانچ روپیہ کو درود شریف ہدیہ ہوا اس کے بعد یہ قاعدہ ہوا کہ جو کچھ لکھتے تھے بڑھتی فوراً بک جاتا اس طرح ہماری گزراوقات بہت عمدگی سے ہونے لگی لیکن موسیٰ ندی کے چڑھاؤ سے ڈر کر شہر میں داخلہ احمد کے مکان میں اٹھ آئے یہ شخص حضور نظام کا خاص ملازم تھا اس کی بہت سی کمائی یہ پرچلتے تھے۔

چندر وزیر بعد خبر پڑی کہ نواب کر جنگ جس نے شہزادوں کو اپنے پاس نہ دیا تھا انگریزوں کے عتاب میں آ گیا ہے اور اب کوئی شخص دہلی کے شہزادوں کو پہنچانے نہیں دیکھا بلکہ جس کسی شہزادے کی خبر ملے گی اس کو گرفتار کرانے کی کوشش کریگا ہم سب اس خبر سے گھبر گئے اور میں نے اپنے شوہر کو باہر نکلنے سے روک دیا کہ کہیں کوئی دشمن پکڑوانہ دے گھر میں بیٹھے بیٹھے قانون کی نوبت آگئی تو ہمارا ایک نواب کے لڑکے کو قرآن پڑھائی نوکری میرے شوہر نے بارہ روپیہ ماہانہ پر کر لی چپ چاپ اس کے گھر چلے جاتے اور پڑھا کر آجاتے۔ گروہ نواب اس قدر بد مزاج تھا کہ ہمیشہ معمولی نوکروں کی طرح میرے شوہر کی بات نہ کرتا کرتا تھا جس کی برداشت وہ نہ کر سکتے تھے اور گھر میں آکر درود کو دینا مانگتے کہ الہی اس ذلت کی نوکری سے تو موت لاکھ درجہ بڑھ رہے تو نے اتنا محتاج بنایا کل تو اس نواب جیسے سینکڑوں ہمارے غلام تھے اور آج ہم اس کے غلام ہیں۔ اسی اثنا میں کسی نے میاں نظام الدین صاحب کو ہماری خبر کر دی۔ میاں کی حیدر آباد میں بڑی عزت تھی کیونکہ میاں حضرت کالے میاں صاحب چشتی نظامی غازی کے صاحبزادے تھے جن کو بادشاہ دہلی

اور نظام اپنا پیر تصور کرتے تھے، یہاں رات کے وقت میانہ میں سوار ہو کر ہمارے پاس
تشریف لائے اور سکو دیکھ کر بہت روئے ایک زمانہ تھا جب وہ قلعہ میں تشریف لاتے
تھے تو مسند زرنگار پر بٹھائے جاتے تھے بادشاہ بگیم اپنے ہاتھ سے لونڈیوں کی طرح گسائی
کرتی تھی آج وہ گھر میں آئے تو شاد و تودیا بھی نہ تھا جس پر وہ آرام سے بیٹھ جاتے پچھلا
زمانہ آنکھوں میں پھر لنگھا خدا کی شان کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ میاں بہت دیر تک لات
دریافت فرماتے رہے اسکے بعد تشریف لے گئے صبح کو پیام آیا کہ تہنہ خرب کا انتظام کروادیا
ہے اب تم حج کا ارادہ کرو۔ یہ سفلر جی باغ باغ ہو گیا اور کمر مغفہ کی تیریاں ہونے لگیں۔
حیدر آباد سے روانہ ہو کر بمبئی آئے اور یہاں اپنے پیچھے رفیق بسیج کو خرچ دیکر اسکے گھر
خصمت کروادیا۔ جہاز میں سوار ہوئے جو مسافر یہانتا تھا کہ ہم شاہ ہند کے گھرنے کے ہیں تو
ہمارے دیکھنے کا شوق ظاہر کرتا تھا۔ اس وقت ہم سب درویشانہ رنگین لباس میں تھے ایک
ہندو نے جس کی شاید عدن میں دوکان تھی اور جو ہمارے حال سے بخیر تھا پوچھا کہ تم لوگ
کس منہج کے فقیر ہو اُس کے اس سوال نے زخمی دل کو چھوڑ دیا، میں بولی :-

”ہم مظلوم شاہ گرو کے چیلے ہیں سی ہار باب تھا اور سی ہار گرو پانی لوگوں نے
اُسکا گھر باریچین لیا اور سکو اُس سے جدا کر کے جنگلوں میں نکال دیا اب ہمارے صورت کو ترستا
ہے اور ہم اُس کے درشنوں بغیر بے چین ہیں“

اس سے زیادہ اور کیا اپنی فقیری کی حالت بیان کریں۔ جب اُس نے ہماری اصلی کیفیت لوگوں کو سنی تو بچہ
لے لے لگا اور بولا بہادشاہ ہم سب کا باپ اور گرو تھا کیا کریں رام جی کی بیٹی تھی کہ وہ بگینا برباد ہو گیا
مکہ پہنچے تو اللہ میاں نے ٹھیرنے کا ایک عجیب ٹھکانا پیدا کر دیا۔ عبد القادر نامی
میرا ایک غلام تھا جس کو سینے آزا کر کے کہ بھیج دیا تھا یہاں اگر اس نے بڑی دولت
کمانی اور زمزم کا داروہ ہو گیا۔ اسکو جو ہمارے آنے کی خبر ملی دوڑا سہوا آیا اور قریب
پہنچ کر خوب رو دیا اس کا مکان بہت اچھا اور آرام کا تھا ہم سب میں ٹھہرے چند روز بعد

سُلطانِ روم کے نائب کو جو مکہ میں رہتا ہے ہماری خبر ہوئی۔ تو وہ بھی ہم سے ملنے آیا کسی نے اس سے کہا تھا کہ شاہِ دہلی کی لڑکی آئی ہے جو بے حجابانہ باتیں کرتی ہے نائبِ سلطان نے بعد القادر کے ذریعہ سے ملاقات کا پیام دیا جو بیٹے منظور کیا دوسرے دن وہ ہمارے گھر پر آیا اور نہایت ادبِ قاعدہ سے بات چیت کی آخر میں اُس نے خواہش کی کہ میں آپ کے آنے کی اطلاع حضورِ سلطان کو دینی چاہتا ہوں۔ میں نے اس کا جواب بہت بے پروائی سے دیا کہ اب ہم ایک بڑے سلطان کے دربار میں آگئے ہیں۔ ہمیں کسی دوسرے سلطان کی پرواہ نہیں ہے نائب نے ایک معقول رقم ہمارے اخراجات کے لئے مقرر کر دی اور ہم نو برس وہاں مقیم رہے اس کے بعد ایک سال بغداد شریف ایک سال نجف اشرف دکر بلائے معطایں بس سوا اتنی مدت کے بعد دہلی کی یاد نے یحییٰ کیا اور روانہ ہو کر دہلی آگئے یہاں انگریزوں کی سرکار نے بہت بڑا ترس کھاکر دس روپیہ ماہوار پنشن مقرر کر دی اس پنشن کی رقم کو منکرِ اول تو مجھے ہنسی آئی کہ میرے باپ کا اتنا بڑا ملک لیکر دس روپیہ معاوضہ دیتے ہیں مگر پھر خیال آیا کہ ملک تو خدا کا ہے کسی کے باوا کا نہیں ہے وہ جسکو چاہے دے دیتا ہے جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے انسان کو دم مارنے کی مجال نہیں ہے۔

ساتواں فسانہ

یہیم شہزادہ کی عید

۱۳۳۲ھ کی عید الفطر کا ذکر ہے دہلی میں ۲۹ کا چاند نظر آیا۔ درزی خوش تھے کہ ان کو ایک دن کام کرنے کو بل گیا۔ جوتے والوں کو بھی خوشی تھی کہ ایک روٹی پکائی

بڑھ گئی۔

مگر مسلمانوں کے ایک غریب محلہ میں تیموریہ خاندان کا ایک گھرانہ اس ن بہت غمگین تھا یہ لوگ عصر سے پہلے اپنے گھر کے وارث میرزا دلدار شاہ کو دفن کر کے آئے تھے۔ دلدار شاہ دس دن سے بیمار تھے ان کو پا بخر و پیہ ماہوار پنشن ملتی تھی۔ گھر میں ان کی بیوی اور یہ خود کناری بننے تھے جس میں ان کو اتنی معقول آمدنی تھی کہ خوب آرام سے بسر وقات کرتے تھے۔

ان کے چار بچے تھے۔ تین لڑکیاں اور ایک لڑکا دو لڑکیوں کی شادیاں ہو گئی تھیں ایک ڈیڑھ سال کی گود میں تھی اور ایک لڑکا دس برس کا تھا۔

دلدار شاہ اس لڑکے کو بہت چاہتے تھے بیگم نے بہت چاہا کہ لڑکا مکتب میں جاکر دلدار شاہ کو بچہ اسقدر لاڈ لگتا کہ انھوں نے ایکٹن اسکو مکتب بھجوا۔

لڑکا سارا دن گلیوں میں آوارہ پھرتا تھا۔ زبان پر گالیاں اسقدر چڑھ گئی تھیں کہ بات بات میں مغلطات بکاتا تھا۔ اور با و ا جان اس کی بھولی بھولی باتوں سے خوش ہوتے میرزا دلدار شاہ بہادر شاہ کے قریبی رشتہ دار تھے۔ مرتے وقت انکی عمر ۶۵ برس کی ہو گئی۔ کیونکہ جب یہ لڑکا ان کے ہاں پیدا ہوا ہے تو انکی عمر ۵۵ برس کی تھی۔

بڑھاپے کی اولاد سب کو پیاری ہوتی ہے۔ خاص کر بیٹا۔ میرزا دلدار شاہ جتنی محبت کرتے تھوڑی تھی۔

ایک دن ان کے دوست نے کہا۔ صاحب عالم بچہ کے لکھنے پڑھنے کی بھی عمر ہے اب نہ پڑھے گا تو کب پڑھیں گا۔ لاڈ پیار بھی ایک حد تک اچھا ہوتا ہے آپ اس کے حق میں کانتے بولتے ہیں۔ خدا آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے زندگی کا کوئی اعتبار نہیں ایک دن سب کو مرنا ہے خدا نخواستہ آپکی آنکھیں بند ہو گئیں تو اس معصوم کا کہیں ٹھکانہ نہیں رہیگا لکھ پڑھ لیگا تو دور ویشاں کما کھائیگا اس زمانہ میں صرف

کی گزراں بڑی دشوار ہو گئی ہے کچھ آئندہ کا بھی خیال رکھنا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ اسکو غیروں کے آگے ہاتھ بھیلنا پڑے۔ اور بزرگوں کی ناک سکے۔

مرزا دلدار شاہ اس ہمدردی سے بگڑ گئے اور بولے آپ میرے مرنے کی شگونی کرتے ہیں ابھی میری کوئی ایسی عمر ہو گئی ہے۔ لوگ تو توبہ برس تک زندہ رہتے ہیں ڈاچہ کا بڑا ہانا سو میرے نزدیک تو اسکی کوئی ضرورت نہیں۔ بڑے بڑے، بی۔ اے پاس مارے مارے پھرتے ہیں اور دو کوڑی کو کوئی نہیں پوچھتا میرا بچہ پہلے ہی دہان پان ہے۔ آئے دن کامر میں ہے۔ میرا دل گوارا نہیں کرتا کہ ظالم استادوں کے حوالے کر کے اسکی نازک ہڈیوں کو قچیوں کا نشانہ بناؤں جب تک میرے دم میں دم ہے میں براؤنگیاں نہ رہوں گا تو خدا رازق ہے وہ چوتھی تک کو کھانا دیتا ہے۔ پتھر کے کپڑے کو رزق پہنچاتا ہے آدمی کے بچے کو کہیں بھوکا مارے گا۔ میاں بہنے زمانہ کا بڑا گرم سرد رنگ دیکھا ہے ہمارے ماں باپ نے بھی سہکونہ پڑا یا تو کیا ہم بھوکے مرنے ہیں۔

نصیحت کرنے والے بچارے یہ جواب سن کر چپ ہو گئے اور دل ہی دل میں پتیا کہ ناحق ان سے درد مندی کی بات کہی لیکن انھیں خیال آیا کہ حق بات کہنے سے چپکا رہنا گناہ ہے الشیء عن الحق شیء عن الحق سچی بات کہنے سے خاموش رہنے والا گونگا شیطان ہے۔ اسلئے انھوں نے پھر کہا کہ جناب آپ ناراض نہ ہوں میں خدا نخواستہ آپ کا مرنا نہیں چاہتا میں نے تو دو ورنہ اندیشی کی بات کہی تھی آپ کو ناگوار گزری تو معاف فرمائیے۔ مگر یہ تو خیال فرمائیے کہ آپ کے بچپن میں اور حالت تھی اور آج کل اور زمانہ ہے اس وقت قلعہ آباد تھا۔ جہاں پناہ طلب سجان بھادشاہ حضرت کا سایہ سر پر تھا ہر بات سے بیفکری تھی لیکن آج تو کچھ بھی نہیں نہ بادشاہی ہے نہ امیری ہے ہر لہان کے گھر میں گدائی اور فقری ہے اب تو جو ہنرمندی سیکھے گا اور اپنی موت اپنے بازو سے کمانیگا وہی لالو نکال لال بنے گا ورنہ دولت و خواری کے سوا

کچھ نہ ہاتھ آئیگا۔

دلدار شاہ نے کہا ہاں یہ سچ ہے میں سکو سمجھتا ہوں۔ مگر آخر ہمارے بھی تو اتنی عمر اسی بربادی کے زمانہ میں بسر ہو گئی۔ سرکار نے باختر و ہند کی جو پیشین مقرر کی ہے تم جانتے ہو کہ اس میں ہمارے کس وقت نکلے ہونگے۔ آٹھ آٹھ روز تو بچتہ کا خرچ ہے ہم دونوں میاں بیوی روپیہ ڈیڑھ روپیہ کی روزگاری بنے ہیں اور مزے سب گذر اوقات کرتے ہیں یہ باتیں ہو رہی ہیں کہ ایک تیسرے صاحب تشریف لائے اور انھوں نے کہا آٹھ سال کے بادشاہ کا بیٹا پیدا ہوا گیا۔ جب بادشاہ کو اس کی خبر پہنچی تو وہ بے قرار ہو گیا اور ہاتھ کاغذ مار کر کہا ظالموں نے سب کچھ لوٹ لیا میرے لئے کچھ بھی نہ چھوڑا۔

میرزا دلدار شاہ بیٹن کر بیٹنے لگے۔ اور بولے بھی واہ اچھی بہادری ہے بیٹے کے ناگہانی مرنے سے ایسے گھبرا گئے میاں جب بہادر شاہ حضرت کے صاحبزادے میرزا منگل وغیرہ گولی سے مارے گئے اور ان کے سر کاٹ کر سامنے لائے تو بادشاہ نے خوان میں کئے ہوئے سر دیکھ کر نہایت بے پروائی سے فرمایا الحمد للہ سر خرو ہو کر سامنے آئے مرد لوگ اسی دن کے لئے بچے پائے ہیں۔

جو صاحب خبر لائے تھے وہ بولے کیوں جناب غدر میں کی کیا عمر ہوگی میرزا دلدار شاہ نے کہا کوئی چودہ پندرہ برس کی مجھے سب قعات اچھی طرح یاد ہیں باوا جان ہکولیس کر خاڑی آباد جا رہے تھے کہ بینڈن ندی پر ہکول فوج نے پکڑ لیا۔ والدہ اور میری چھوٹی بہن جینیں مار کر روئے لگیں والد نے ان کو منع کیا اور آنکھ بچا کر ایک سپاہی کی تلوار اٹھالی۔ تلوار ہاتھ میں لینی تھی کہ سپاہی چاروں طرف سے ان پر ٹوٹ پڑے انہوں نے دو چار کوزخمی کیا۔ مگر سنگینوں اور تلواروں کے اتنے داران پر ہوئے کہ بچارے قیمہ قیمہ ہو کر گر پڑے اور شہید ہو گئے۔

ان کی شہادت کے بعد سپاہیوں نے میری بہن اور ماں کے کانوں کو نوچ لیا اور

جو کچھ ان کے پاس تھا چھین کر چلتے ہوئے مجھ کو انہوں نے قید کر کے ساتھ لے لیا۔
جس وقت میں والدہ سے جدا ہو رہا تھا وہ دُعا کرتا تھا کہ میرے
کو تھامے ہوئے چھتی تھیں اور کہتی تھیں۔

ارے میرے لال کو چھوڑ دو تم نے میرے سر تاج کو خاک میں ملا دیا
اس یتیم پر تو رحم کرو میں رنڈیا کس کے سہارے رنڈیا پا کاٹوں گی اللہ
میرا کلیجہ پھٹا جاتا ہے میرا دلدار کہاں جاتا ہے کوئی اکبر و شاہجہاں
کو قبر سے ہائے اُن کے گھرانے کی دکھیا کی میتا سناٹ۔ دیکھو میرے
دل کے ٹکڑے کو تنہی میں سے دیتے ہیں۔ ارے کوئی آؤ میری گودی
کا پالا مجھ کو دلو او۔

چھوٹی بہن آکا بھائی۔ آکا بھائی کہتی ہوئی میری طرف دوڑی۔ مگر سپاہی گھوڑوں
سوار ہو کر چلے گئے اور مجھ کو باگ ڈور سے باندھ لیا گھوڑے دوڑتے تھے تو میں بھی دوڑتا
تھا پاؤں پہ لہان ہو گئے تھے دل دھڑکتا تھا دم اکھڑا جاتا تھا۔

پوچھا میرزا یہ بات رہ گئی کہ پھر تمہاری والدہ اور بہن کا کیا حال ہوا۔
میرزا نے کہا آج تک انکا پتہ نہیں لگا۔ خبر نہیں ان پر کیا گزری اور وہ کہاں گئیں
مجھ کو سپاہی اپنے ہمراہ دہلی لائے اور یہاں سے اندور لیگے مجھ سے گھوڑے ملواتے تھے
اور گھوڑوں کی لید صاف کراتے تھے۔

چند روز بعد مجھ کو چھوڑ دیا گیا اور میں نے اندور میں ایک ٹھاکر کے ہاں درباری کی
نوکری کر لی۔ کئی برس اس میں گزارے۔ پھر دہلی میں آیا اور سرکار میں درخواست دی
اس کی ہربانی سے میری بھی اوروں کی طرح پانچ روپیہ ماہوار پنشن مقرر ہو گئی اس کے بعد
میں نے شادی کی یہ بچے پیدا ہوئے اس واقعہ کے بعد میرزا دلدار شاہ بیمار ہوئے اور
دس دن بیمار رہ کر آخرت کو سدھارے۔

ان کے مرنے کا غم سب سے زیادہ انکی بیوی اور لڑکے کو تھا۔ لڑکا دس برس کا تھا اور اچھی طرح سمجھتا تھا کہ آبا جان مر گئے ہیں مگر وہ بار بار آماں سے کہتا تھا کہ آبا جان کو بلا دو الغرض اس رونے دھونے میں یہ سب لوگ سو گئے۔ سحری کو بیگم صاحبہ بیدار ہوئیں تو دیکھا کہ گھر میں جھاڑو پھری ہوئی ہے کپڑا لٹا۔ برتن بھانڈا سب چور لے گئے بیچاری بیوہ نے سر پٹ لیا۔ ہے ہے اب میں کیا کرونگی میرے پاس تو ایک تن کا بھی نہ رہا گھر کے مالک کے اٹھتے ہی چوری بھی ہوئی۔

اس پاس کے محلہ والے ان کے رونے کی آواز سن کر جمع ہو گئے اور سب نے بہت فیسوں پڑوس میں ایک گولے والے رہتے تھے انھوں نے سحری کے لئے دودھ اور نان پاؤ بیجا۔ اور بیچاری نے ٹھنڈا سانس بھر کے اسکو لے لیا۔

یہ پہلا دن تھا کہ بیوہ شہزادی نے خیرات کی سحری کھائی جس کا اس کو سب سے زیادہ صدمہ تھا۔ دن ہوا چاروں طرف عید کے سامان نظر آتے تھے چاند رات کی چل پھل ہر گھر میں تھی مگر نہ تھی تو اس گھر میں جہاں دودھ پیتی کچی کو گود میں لئے بیوہ شہزادی یتیم شہزادہ کو سمجھا رہی تھی۔ کیونکہ وہ نئی جوتی اور نئے کپڑے مانگتا تھا۔ ماں نے کہا ”بیٹا تمہارے آبا جان پر دیس گئے ہیں وہ آجائیں تو کپڑے منگا دیں گے۔ دیکھو تمہارے دولہا بھائی بھی بنارس گئے ہوئے ہیں وہ ہوتے تو ان سے ہی منگا دیتے۔ اب کس کو بازار بھیجوں۔“

لڑکے نے کہا میں خود لے آؤنگا مجھ کو دام دو۔ دام کا نام سن کر دکھیا ری بیوہ کے آنسو آگئے اس نے کہا تمہیں خبر نہیں رات کو گھر میں چوری ہو گئی ہمارے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔

خندی شہزادہ نے چل کر کہا نہیں میں تو ابھی لوں گا۔ یہ کہہ کر دو چار گالیاں ماں کو دیا مصیبت زدہ نے ٹھنڈا سانس بھر کر آسمان کو دیکھا اور بولی اچھا ٹھہروں منگاتی ہوں

یہ کہہ کر پڑوس کے گھر سے لگی ہوئی کھڑکی میں جا کر کھڑی ہوئی اور گوٹے والے کی بیوی سے کہا۔ بواعدت کے دن میں میں اندر تو نہیں آسکتی ذرا میری بات سن جاؤ وہ بچاوی فوراً اس کے پاس آئی تو اُسے سارا ماجرا سنایا اور کہا خدا واسطہ کا کام ہے اپنے بچے کی اُترن کوئی جونی یا کپڑوں کا جوڑا ہو تو ایک دن کے لئے مانگے دید وکل شام کو واپس دید وں گی۔

شہزادی اُترن کہتے وقت بے اختیار ہچکی لے کر رونے لگی۔ پڑوس کو بڑا ترس آیا اس نے کہا بواورونے اور جی بھاری کرنے کی کچھ بات نہیں نہنے کی کئی جوتیاں اور کئی جوڑے فالتور رکھے ہیں ایک تم لے لو۔ اس میں اُترن کا خیال نہ کرو اس نے تو ایک دن یونہی دریا پاؤں میں ڈالی تھی میں نے شکوا کر رکھ دی۔

یہ کہہ کر پڑوس نے جونی اور کپڑے شہزادی کو دیئے۔ شہزادی یہ چیزیں لیکر بچے کے پاس آئی اور اس کو یہ سب کھائیں بچہ خوش ہو گیا۔

دوسرے دن عید گاہ جانے کے لئے شہزادی نے اپنے بچہ کو بھی گوٹہ والے پڑوسی کے ساتھ کر دیا۔ عید گاہ پہنچ کر تیسرا شہزادے نے گوٹہ والے کے لڑکے سے کہا بے تیری ٹوپی سے ہماری ٹوپی اچھی ہے گوٹہ والے کے لڑکے نے جواب دیا۔

”جل بے اُترن کتھن پر اترتا ہے۔ ابلے یہ بھی میری ٹوپی ہے اماں نے خیر خیرات دیدی ہے۔“ یٹھنا تھا کہ شہزادہ نے ایک زور کا پھٹکر گوٹہ والے کے بچے کے مارا اور ہم کو خیرات خورہ کہتا ہے۔

گوٹہ والے نے جو اپنے بچے کو پتا دیکھا تو اس کو بھی غصہ آ گیا اور اس نے دو تین طمانچے شہزادے کے مارے۔ یہ لڑکاروتا دھوتا بھاگا گوٹہ والے نے خیال کیا کہ اسکی ماں کیا کہے گی کہ ساتھ لے گئے تھے کہاں چھوڑ آئے اسلئے وہ اس کے کہنے کو دڑا مگر لڑکا نظروں سے غائب ہو گیا ناچار گوٹہ والہ مجبور ہو کر اپنے گھر چلا آیا۔

اب شہزادہ کی یہ کیفیت ہوئی کہ عام خلقت کے ساتھ عید گاہ سے گھر کی طرف آ رہا تھا کہ راستہ میں ایک گاڑی کی جھپٹ میں آکر گر پڑا اور زخمی ہو گیا پولیس شفا خانہ لے گئی۔

یہاں گھر میں اس کی ماں کا عجب حال تھا غش پہ غش آتے تھے دو وقت سے بھوک تھی اس پر عید اور یہ صیبت کہ لڑکا گم ہو گیا اور عالم یہ کہ کوئی پرسان حال نہیں جو لڑکے کو تلاش کرنے جائے آخر وہی بچا رگوٹ والا پھر گیا اور پولیس میں اطلاع لکھوائی۔ اس وقت معلوم ہوا کہ وہ شفا خانہ میں ہے۔ شفا خانہ جا کر خبر لایا اور شہزادی کو ساری کیفیت سنانی۔ اس وقت عجیب عالم تھا۔

عید کی شام تھی گھر گھر خوشیاں منائی جا رہی تھیں مبارکبادوں کے چرچے تھے تحفے کا لف اور عیدیاں تقیم ہو رہی تھیں ہر مسلمان نے اپنی حیثیت سے زیادہ گھر کو آراستہ کیا تھا اور اپنے بال بچوں کو خوش و خرم لئے بیٹھا تھا مگر بچاری بیوہ شہزادی دو وقت کے فاقہ سے رنجور بچہ کے غم میں انگبار اندھیرے اجاڑ گھر میں بیٹھی آسمان کو دیکھتی تھی اور کہتی تھی ”خدا یا میری عید کہاں ہے“ اور بے اختیار ہچکیاں لیکر روتی تھی۔ ادھر شفا خانہ میں یتیم شہزادہ ماں کی جدائی میں پھر مکتا تھا۔

آٹھواں فسانہ

غدر کے مارے پیر جی گھسیاے

حضرت دین علی شاہ قلندر دہلی کے نامی بزرگ تھے قراٹخانہ کے باہر انکا تکیہ

اب تک مشہور ہے میں غدر سے پہلے عالم شباب میں سرشاران کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔

مجھ کو اپنی پیرزادگی کے گھنٹہ کے ساتھ روپیہ کاغذ و رہتھ صورت شکل کا تکبر تھا اور اپنے زور و قوت پر بہت اکرٹا تھا۔ ماں باپ کا اکلوتا تھا آبا سے زیادہ اماں کو مجھ پر پیار تھا۔ والد خاص بازار میں رہتے تھے اور ان کے ہزار ہا مرید تھے شہزادے شہزادیاں ہر وقت ان کے پاس آتی تھیں نذر نیا زک کچھ اندازہ نہ تھا غرض ہم بے مکان منہ اڑاتے تھے۔ مگر آبا جان کا یہ عالم تھا کہ وہ باوجود اتنی کثیر آمدنی کے ہمیشہ نگینہ سازی کر کے گزراوقات کرتے تھے۔ مریدوں کے روپیہ کو ہاتھ نہ لگاتے تھے۔

ایک دن میں نے والدہ سے پوچھا کیوں بی۔ یہ اباجی گھر میں سب کچھ ہوتے سلتے نینگے کیوں گھسا کرتے ہیں۔ بڑی بے عزتی کی بات ہے خدا نے سب کچھ دیا ہے پھر خواہ مخواہ پاڑ پیلے ہیں۔

اماں جان نے ہنس کر کہا۔ بیٹا ان کا عقیدہ ہے کہ فقیر وہی کامل ہے جو اپنی روٹی اپنے ہاتھ سے کمائے دوسروں کے ہمارے پر ہاتھ پاؤں توڑ کر نہ بیٹھے۔ اٹکا کہنا ہے کہ امیر مریدوں سے جوئے وہ غریب مریدوں کا حصہ ہے ہمارا نہیں ہے ہم کو اپنی معاش خود حاصل کرنی چاہئے میں نے کہا تو کیا مریدوں کی نذر نیا زک حرام ہے جو وہ نہیں کھاتے اماں نے کہا نہیں حرام تو نہیں مگر وہ ہمارا حق نہیں ہے دوسروں کا حصہ ہے۔ خدا تعالیٰ یہ فتوحات اس لئے بھیجتا ہے کہ ہم اپنے محتاج بھائیوں کی خبر گیری کریں اور خود جب تک ہاتھ پاؤں چلتے ہیں اپنی روٹی آپ کمائیں

دروانہ چھو کر می

اس گفتگو کے تیسرے دن نواب زینت محل صاحبہ بیگم خاص حضور جہاں پناہ

محمد بہادر شاہ ابا کی خدمت میں آئیں۔ اس کے ہمراہ ایک پیش خدمت دردانہ نامی بھی جو ہنسی اس پر ہنسی نگاہ پڑی دل میں ایک تیر سال کا۔ اس نے بھی محکوم ایک شوقیہ نظر سے دیکھا مگر دونوں بے بس تھے بات نہ کر سکتے تھے۔

بیگم صاحبہ نے کئی بار دردانہ کو کہہ کر پکارا تو نام بھی معلوم ہوا اور نہ شاید اس کا موقع ملنا بھی محال تھا کہ میں خود چھو کر ہی کا نام پوچھتا۔

بیگم صاحبہ چلی گئیں۔ میرا حال غیر ہونا شروع ہوا دورات بالکل نید نہ آئی رہتی تک چھوٹ گئی۔ ہر چند سوچتا کہ دردانہ سے ملنے کی صورت نکالے مگر کوئی شکل سمجھ میں نہ آتی تھی۔ آخر جب بے قراری حد سے بڑھی تو حسب معمول حضرت دین علی شاہ قلندر کی خدمت میں حاضر ہوا اور ساری بتی انکی خدمت میں عرض کی انھوں نے تبسم فرمایا اور چپکے ہو گئے دوبارہ سوال کی جزا نہ ہوئی نام ادا دھڑکڑا ادا اسے استہ میں حین تنگ باز ملا جو میرا بڑا یا غار تھا۔ اس نے جو اتری ہوئی شکل دیکھی گھبرا کر پوچھنے لگا۔ کہو دوست خیر تو ہے۔ تمہارے چہرے پر ہوا سیاں کیوں اڑ رہی ہیں اور آنکھوں میں حلقے کا ہے سے پڑ گئے ہیں میں نے کہا بھائی دردانہ نامی چھو کر ہی کی محبت سر پر ہوا ہے۔ یہ عجیب م کا نیا آواز ہے میں تو اس کو چہ سے واقف بھی نہ تھا۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے تقدیر اس ناشاد جوانی کے ہاتھوں کسی کسی رسوائیاں دکھاتی ہے۔ دردانہ کو ملواتی ہے یا ہکو جان ہار دنیات قبرستان بھجاتی ہے۔

حسینی بولا بھئی یہ بھی کوئی فکر کی بات ہے نصیب کی کہاری کی معرفت دردانہ سے مل لو یہ کہاری محل میں آتی جاتی ہے جو کہو گے دردانہ تک پہنچا دیگی۔

حسینی نے ایسی تجویز بتائی کہ میرے دل کا کاٹا نکل گیا۔ سید ہاگو سیوں کے محلہ میں گیا جہاں وہ کہاری رہتی تھی اور کچھ دیکر اسکو پیام رسانی پر راضی کر لیا۔

دوسرے دن وہ کہاری میرے پاس آئی اور دردانہ کا یہ پیام لائی کہ میرا ملنا دشوار

ہے۔ جب تک کہ تم کوئی حیلہ نہ کرو اور وہ یہ ہونا چاہتے کہ شہر کے باہر کہیں چلے کر لے بیٹھو میں بیگم صاحبہ کو لیکر وہاں آؤنگی اور پھر ہمیشہ کی آمد و رفت کے موقعے نکال لوں گی۔ دردانہ کی یہ بات میرے ذہن میں آگئی۔ سید ہا اماں کے پاس گیا اور کہا۔

”لو بیو تم ہمیشہ کہا کرتی تھیں کہ باپ کے ورثہ کا خیال نہیں۔ نہ ذکر ہے نہ شغل ہے نہ نماز ہے نہ روزہ ہے یہی دن کچھ حاصل کرنے کے ہیں کچھ سیکھنا ہے تو آج سیکھ لو کل خدا نخواستہ آبا کی آنکھیں بند ہوئیں تو یہ دولت دوسرے الفتوں کے پاس چلی جائے گی اور تم ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے۔ پس آج میں تمہارے ارشاد کی تعمیل کو حاضر ہوں۔ آبا سے کہو کہ مجھے کچھ بتائیں میں حضرت دین علی شاہ کے تکیہ کے پاس چلے کر دوں گا۔ اماں نے کہا نہ میاں مجھے جنگل میں رکھنا منظور نہیں کچھ کرنا ہے تو گھر میں کرو۔ یہ بندی ایک آن تم کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دی گئی۔

میں نے ہر چند سمجھا یا مگر اماں کے خیال میں نہ آیا۔ آخر آبا کو اس قصہ کی خبر ہوئی وہ میرے ارادہ سے بہت خوش ہوئے اور اماں کو راضی کر کے چند خفی دھواں کار تعلیم فرما کے تکیہ میں بھیج دیا۔ دونوں وقت گھر سے نوکر جانا کھانا دے آتا خیر سلا لے آتا۔ اوزہم بے غل و غش اپنے کام میں مصروف رہتے۔

دو جاسوس

چوتھے پانچویں دن کا ذکر ہے میں رات کے وقت بیٹھا وظیفہ پڑھ رہا تھا کہ اتنے میں دو اجنبی آدمی میرے حجرے میں آئے وہ دریدہ اور کپڑے لباس میں تھے میں نے اشارہ سے کہا کون ہو۔ بولے مسافر ہیں مجھ کو کچھ شک ہو کہ یہ چور نہ ہوں وظیفہ چھوڑ کر پوچھا یہاں آنے کی کیا غرض ہے بولے آپ سے تویذ لینے آئے ہیں دردانہ بیوی نے آپ کا پتہ بتایا تھا

دُردانہ کا نام سُکر جان میں جان آگئی۔ رات کا وقت تھا چراغ ٹٹمار ہا تھا
میں ان مسافروں کی شکلیں بچان نہ سکا۔ دل ہی دل میں سوال کر رہا تھا کہ یہ مسافر کون
ہیں جو دُردانہ کو بھی جانتے ہیں۔

آخر میں نے کہا۔ آپ دُردانہ کو کیونکر پہچانتے ہیں۔ مسافر بولے بیگم صاحبہ خرچ
را دیا ننگے گئے تھے۔ وہاں ان سے ملاقات ہوئی بہت ملنسار اور نیک بوی میں
میں نے کہا تم کس بات کا تنوید چاہتے ہو۔ انھوں نے کہا تسخیر کا۔ پوچھا کس کے
لئے۔ ہنس کر بولے شہزادہ جو ان بخت کے واسطے۔

اب میری حیرت حد سے بڑھ گئی۔ شہزادہ جو ان بخت زینت محل کے لاڈلے
لڑکے تھے۔ انگریزوں نے میرزا دارا بخت کے مرنے کے بعد میرزا فرخ کو ولیعہد کیا
تھا اور زینت محل اس کوشش میں تھیں کہ جو ان بخت صاحب تاج ہو۔

میں نے کہا تو جو ان بخت کو کس کی تسخیر مطلوب ہے۔ یہ سُکر مسافروں نے تپنے نکال
لئے اور میری طرف اُن کا منہ کر کے بولے خبردار بھید کی سے نہ کہنا ہم جو ان بخت
کے جاسوس ہیں۔ تم سے یہ کام ہے کہ تمہارے والد کے پاس جو خفیہ کاغذات
شاہ عالم کے ہیں اور جن میں شاہی دفینوں کا حال ہے وہ ہم کو لا دو اگر تم نے
اس کی تعمیل کا اقرار نہ کیا تو ابھی کام تمام کر دیں گے۔

تپنے دیکھ کر ذرا گھبراہٹ ہوئی۔ مگر میں نے اپنے اوسان درست کر کے کہا مجھے
کچھ عذر نہیں بشرطیکہ دُردانہ مجھ سے ملنے کا اقرار کریں اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ
تمہارے ساتھ ہیں اور انہی سے تم کو کاغذات کا پتہ چلا ہے۔ کہا ہاں یہ سچ ہے
دُردانہ تم سے ملے گی معلوم ہوا ہے کہ شاہ عالم بادشاہ نے اپنا بزرگ راز دار سمجھ کر
دفینوں کی یادداشت تمہارے باپ کے پاس امانت رکھ دی تھی اور کہا تھا کہ ضرورت
کے وقت میرے لایق جانشینوں کو دے دینا۔

میں نے پوچھا تو کیا دُر دانہ رات کو محل میں رہتی ہے۔ بولے نہیں! دہی رات کے قریب وہ کشمیری دروازہ کے مکان میں آ جاتی ہے اور وہیں ہم رہتے ہیں۔ میں نے ان سے مکان کا پتہ دریافت کیا اور اس کے بعد کہا کہ صاحب مجھے کاغذ لادینے میں کوئی عذر نہیں۔ گرد والد صاحب نے خبر نہیں ان کو کہاں رکھا ہے میں نے تو آج تک ان کا ذکر بھی نہیں سنا۔

جاسوسوں نے کہا دیکھو جھوٹ نہ بولو جس نغم نے دُر دانہ کو دیکھا ہے اُسی دن کاغذوں کا ذکر رہا تھا۔

اب تو میں ذرا پریشان ہو گیا۔ آخر جی کڑا کر کے کہا۔ صاحب! تو مجھ سے نہ ہو گا۔ یہ سنتے ہی اُنھوں نے پھر پیچھے نکال لئے اور میری طرف اُنکو چھتیا یا۔ بدن میں طاقت تھی و سان درست تھے میں نے لپک کر تنچوں کو پکڑ لیا اور جھٹک دے کے چھین لیا اور اس کے بعد ایک مکہ اس کے اور ایک مکہ دوسرے کے اس زور سے مارا کہ وہ جکڑا کر گر پڑے۔ اور میں نے دوڑ کر اُنکے ہاتھ باندھ دیئے۔ دونوں کو باندھ کر حجرہ میں قفل لگا کر میں کشمیری دروازے پہنچا۔ کوئی گیارہ بجے کا عمل ہو گا۔ جاسوسوں کے بتائے ہوئے مکان پر جا کر آواز دی دُر دانہ نے پوچھا کون ہے۔ میں نے کہا ذرا دروازہ پر آؤ۔ دُر دانہ قریب آئی تو میں نے کہا۔ ان دونوں صاحبوں نے بھیجا ہے۔ وہ تیکے کے پاس جو شاہ صاحب آکر رہے ہیں وہاں بیٹھے ہیں۔ اور شاہ صاحب سے اقرار ہو گیا ہے اس لئے اُنھوں نے تم کو بلایا ہے۔ کہ آ جاؤ تو کاغذات ابھی مل جائیں دُر دانہ نے کہا تو ڈولی منگا لو چلتی ہوں۔

میں محلہ میں جا کر ڈولی لے آیا۔ اور کہا روں کو چپکے سے سمجھا دیا کہ خاص بازار لے چلنا۔ چنانچہ دُر دانہ کو سوار کر کے میں اپنے گھر آیا۔ اور ایک علیحدہ دالان میں داری کو مڑوایا۔ اتنا اُس وقت سو گئی تھیں۔ آبا بالا خانہ پر تھے۔ اتنا کو جگا کر سارا حال کہا دہ

ڈریں مگر میری عاجزی سے چپ ہو گئیں۔ اور میں دُردانہ کو دوسرے دالان میں لگیا
چراغ روشن کرتے ہی دُردانہ ہک دھک رہ گئی۔ اور بولی ہانس تم یہاں کہاں لائے۔
میں نے کہا دیکھو صاحب اب یہ تمہارا گھر ہے۔ اگر تم نے شور و غل مچایا تو جان
کی خیر نہیں۔ اُن جاسوسوں کو میں نے قید کر لیا ہے اور تم بھی میری قید میں ہو۔ گو میرا
دل تمہارا قیدی ہے۔ میں سب حال سے خبردار ہو گیا ہوں تم رضا مندی سے چپ ہو گئیں
تو یہ تمہارا گھر ہے بیوی بنا کر رکھو ننگا۔ ورنہ تم کو اور ان دونوں کو جان سے مار ڈالوں گا۔
دُردانہ نے کہا۔ مجھے آپ کے ہاں رہنے سے کوئی عذر نہیں۔ میرا دل تو خود اسی کا
آرزو مند تھا۔ مگر ان جاسوسوں کو چھوڑ دو ورنہ خیر نہ ہوگی۔ بڑا ہتکدہ پڑ جائیگا اگر ان کا
بال بیکا ہوا۔ میں نے کہا اگر ان کو چھوڑ دیا تو میری شکل آئیگی۔ دُردانہ نے کہا کچھ مشکل نہیں
تم ابھی وہاں جاؤ اور ان سے کہو کہ اصلی کاغذات تو لا نہیں سکتا ان کی نقل لا دیتا ہوں
مگر اس شرط پر کہ دُردانہ کے معاملہ پر وہ ڈال دیا جائے۔

میں نے کہا کہ مجھ سے تو یہ منک حرامی نہ ہوگی کہ اپنے اوپر بھروسہ کرنے والے بادشاہ
کا بھید دوسروں کو دے دوں۔ دُردانہ نے کہا یہ کوئی مشکل بات نہیں۔ فرضی باتیں
کاغذوں میں لکھ دو۔ اُنھوں نے اصل کاغذات دیکھے تھوڑی ہیں جو وہ شک کریں گے
قلعہ کے اندر دھپتے ہیں وہ اُن کو کھو د بھی نہیں سکتے۔ صرف یادداشت چاہتے ہیں۔
نامہ آئندہ کے لئے کام آئے۔

میں نے اس تجویز کو پسند کیا اسی وقت کہ رات کا ایک بجاتھا پھر تکیہ پر گیا۔ ججہ سے
جاسوسوں کو نکالا۔ اور سارا حال کہا وہ بولے کہ اگر تم ان کاغذات کی نقل دیدو گے
تو ہم دُردانہ کے معاملہ میں تمہارا ساتھ دیں گے۔

وہ رہا ہو کر اپنے گھر گئے اور میں نے کہا کہ کل دوپہر کو نقل آپ کے مکان پر پہنچ جائیگی۔
دوسرے دن صبح سے میں نے نقل شروع کی۔ دُردانہ اپنی ذہانت سے فرضی مقامات

بتاتی جاتی تھی اور میں لکھتا جاتا تھا۔

اتنے میں آبا جان بالا خانہ سے نیچے آئے میں ان کی خفگی کے ڈر سے اماں کے پاس چلا گیا۔ دُردانہ نے جھجک کر سلام کیا والد اماں کے پاس گئے تو میں وہاں سے بھی اُٹھ کر چلا آیا۔ اماں نے سارا حال بیان کیا۔ آبا یہ حالت سُکر سناٹے میں آگئے اور بولے اب خیر نہیں۔ ارے بڑا غضب ہوا۔ اور یہ توجہ کر لے گیا تھا۔ اس مینا کو کہاں سے لے آیا اچھا اچھا تو میں ان دونوں کا کام تمام کئے دیتا ہوں۔

یہ سُکر اماں ہاتھ جوڑنے لگیں وراٹا کا غصہ ٹھنڈا کیا۔ ابا میدہ میرے پاس لے اور دُردانہ کے فرضی بتائے ہوئے کاغذات کو دیکھا تو مسکرائے اور بولے بھی خوب جُل دیا ہے۔ خیر تمہاری مرضی۔

والد باہر گئے۔ میں سیدھا جاسوں کے مکان پر پہنچا اور کاغذ ان کو دیا جس کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے اور کہا کہ جواں بخت کو تخت مل گیا تو نہال کر دیا جائیگا۔ اس کے بعد میں گھر آیا اور دُردانہ سے نکاح کر کے ہنسی خوشی رہنے لگا۔

غدر

چند روز کے بعد غدر کا ہنگامہ برپا ہوا۔ والد صاحب غدر سے پہلے اپنے ایک مرید کے ہاں انبالہ چلے گئے تھے میں اور دُردانہ بھی ساتھ تھے۔

جب غدر کا فتنہ فرو ہوا تو انبالہ ہی میں والد صاحب نے رحلت فرمائی اور میں بی بی میں واپس آیا۔ مگر یہاں دیکھا تو خاص بازار کھڑ کر زمین کے برابر ہو چکا تھا ناچار ایک مکان کرایہ کو لیا اور اس میں رہنا شروع کیا۔

اب والد کے جتنے مرید و معتقد تھے وہ یا تو جلا وطن ہو گئے تھے یا پھانسیاں باگئے تھے۔ یا غریب و غلس ہو گئے تھے۔ محکومان سے اردو کا کوئی موقع نہ رہا تھا۔ اور خود کچھ کلمہ آنا

تھا۔ جو گذر اوقات کی سبیل ہوئی۔ کچھ دن تو بچھلا اند وختہ خرچ ہوتا رہا۔ اس کے بعد تنگی شروع ہوئی دو ایک فاقے بھی ہوئے۔ اب ہمارے دو بچے بھی تھے اور مردان بہت فضول خرچ واقع ہوئی تھی۔ آخر دُرْدانہ کے مشورہ سے ہم نے پھر چلے کی ٹھانی اور اسی پرانے حجرہ میں جا کر آسں جایا۔ چند روز کے بعد ہندو عورتیں تعویذ گنڈے کے لئے آئے لگیں۔ اور صبح سے شام تک روپیہ سواروپیہ کی آمدنی ہو گئی۔

پانچ پیسہ کا تعویذ دینا اور پانچ آئے کو گنڈا یہ معمول ہو گیا تھا۔

ایک دن دوپہر کو سوتا تھا کہ خواب میں حضرت دین علی شاہ قلندر اور اپنے والد کو دیکھا کہ وہیں آپس میں باتیں کر رہے ہیں اور کہتے ہیں دیکھو میں نے ساری عمر نیکینہ سازی کی اور میرا بیٹا دوسرے کی کمائی پر ذلیل اوقات بسر کرتا ہے۔

آنکھ کھلی تو بے اختیار رونا آگیا۔ سید ہا دُرْدانہ کے پاس آیا اور سارا حال اُس سے کہا دُرْدانہ نے کہا خواب خیال ہیں۔ اب یہ نہ کرو گے تو کیا کرو گے کام کچھ آتا نہیں۔

میں نے کہا نوکری کروں گا۔ یہ ٹھان کر نوکری کی تلاش شروع ہوئی اور ایک مکتب میں دس روپیہ ماہوار کی ملازمت کر لی۔

اسی زمانہ میں دُرْدانہ بیمار ہوئی۔ ہر چند علاج کیا۔ مگر جان نہ ہو سکی۔ اس کے مرنے نے مجھ پر بچوں کی پرورش کا بوجھ ڈال دیا۔ نوکری پر جاتا تو بچوں کو ساتھ لیجاتا۔ بازار میں وٹی کھانا۔ غرض اس طرح بشکل ایک سال گذرا۔

پکائیوالی ماما

مکتب میں میری ترقی ہو گئی۔ بین روپیہ ملتے تھے اور شام کو دو لڑکے گھر پر پڑنے آتے تھے۔ تین روپیہ میرے لئے بہت تھے۔ اس لئے ایک دن یہ خیال ہوا کہ کبھی پکائے والی ماما کو نوکر رکھنا چاہئے بغیر اسکے گزارا مشکل ہے۔

اسی تلاش میں تھا کہ ایک دن ایک غریب عورت برقعہ اوڑھے بھیک مانگنے آئی۔ میر نے کہا نیک بخت نوکر مری کرے۔ بھیک مانگنا بہت بُرا ہے۔ اس عورت نے رونے کی آواز میں کہا۔ میاں تم ہی نوکر رکھ لو۔ سب ضمانت مانگتے ہیں میں کہاں سے ضمانت لاؤں۔ میں نے کہا تم کون ہو۔ تمہارا کوئی ولی وارث بھی ہے۔ اس نے بے اختیار ہچکیاں لیکر رونا شروع کیا۔ اور کہا سوائے خدا کے کوئی نہیں۔ زیادہ نہ پوچھو کہ مجھ میں بیان کی تاب نہیں ہے۔

میں نے کہا اچھا تو ہمارے یہاں روٹی پکا پا کر وہ اس نے قبول کیا اور روٹی پکانے لگی۔ مگر ہمیشہ وہ پردہ کا خیال رکھتی تھی۔ اور کبھی میرے سامنے نہ آئی تھی۔ لیکن ایک دن اتفاق سے میری نگاہ اس پر پڑ گئی۔ دیکھا نو جوان اور قبول صورت تھی بیٹے اس سے کہا صحت بڑی شکل ہے تمہارے پردے سے توجہ گھبراتا ہے۔ کیوں نہ تم مجھ سے نکاح کر لو تاکہ یہ حجاب اٹھ جائے ماما نے کچھ رک کر آخر اقرار کر لیا اور میں نے اس سے نکاح پڑھ لیا۔ نکاح کے بعد بیٹے اس کو دیکھا تو صورت کچھ آشنا سی نظر آئی۔ مگر سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں نے پہلے اس کو کہاں دیکھا ہے۔ ایک دن اس نے خود ہی کہا۔ تم کو شاید یاد ہو میں بچپن میں اماں جان کے ساتھ تمہارے گھر میں بہت آیا کرتی تھی۔ میں بہادر شاہ باؤشاہ کی نواسی ہوں۔ گوہر بیگم میرا نام ہے۔ گوہر بیگم نام سن کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ خدا کی قسم یہ وہی شہزادی تھی جس کے بڑے چاچو چلے تھے۔ اپنی اماں کی اکلونی تھی اور ہمارے ہاں بڑی شان و شوکت سے آیا کرتی تھی۔

میں نے پوچھا۔ آخر بتاؤ تو وہی تم پر غدر میں کیا کیا بیٹی۔ اور تم اب تک کہاں کہاں رہیں؟

شہزادی کی آپ بیٹی

غدر میں میری عمر تیرہ سال کی تھی۔ غدر ہی کے اندر اماں جان کا انتقال ہو گیا اور میں

بڑی دائی کے پاس رہتی تھی۔ جب بادشاہ دہلی سے بھاگے تو دائی مجھو لیس کر انگریزی جرنیل کے پاس چلی گئی اور سارا حال بیان کیا۔ اس نے بہت محبت سے اپنے خیمہ میں مجھو رکھا اور دوسرے دن ایک پنجابی مسلمان افسر کے حوالہ کر دیا۔ وہ افسر مجھو لئے ہوئے لکھنؤ گیا۔ وہاں اس زمانہ میں لڑائی ہو رہی تھی جس میں افسر پنجار مارا گیا اور میں بھاگ کر لٹاؤ چلی گئی۔ اناؤ میں ایک ہندو نے اپنے گھر میں رکھا۔ مگر اس کی نیت بد دیکھ کر میں وہاں سے بھاگی۔ راستہ میں ایک دیہاتی زمیندار ملا اور وہ مجھو اپنے گھر لے گیا اور چند روز کے بعد اپنے لڑکے سے میری شادی کر دی۔ مگر مجھو ان گنواروں میں رہنا دو بھر تھا۔ بس دوزخ کا مزا آتا تھا۔ خدا کی قدرت گنواروں میں وہاں کے کھیت پر لڑائی ہوئی اور میرے شوہر اور سرے کو دشمنوں نے مار ڈالا اور میں اس گھر سے نکل کر کانپور آئی۔ یہاں ایک سوداگر کے ہاں مالگیری کی نوکری کر لی۔ یہ سوداگر بڑا بد چلن تھا مجھ سے تو اس نے کچھ نہ کہا مگر رات دن اس کے ہاں حرام کار عورتوں کی آمد رفت رہتی تھی۔ جس سے میرا جی بیزار ہو گیا اور میں نے چاہا کہ دہلی چلی جاؤں۔ چنانچہ ایک موقع پریشن پہنچی اور بابو سے خوشامد کی کہ مجھے دہلی پہنچا دو۔ اس نے مال گاڑی میں گارڈ کے سپرد کر دیا جس نے مجھو دہلی لاکر اُتار دیا۔

دہلی میں آئی تو حیران تھی کہ ابھی کہاں جاؤں۔ کوئی جان پہچان نہ تھا۔ سوچتے سوچتے چیلوں کے کوچہ میں آئی جہاں میرا تو کہار رہتا تھا۔ اُنو کہار تو مر گیا تھا اس کی بیوی نے حال سنا تو اپنے پاس رکھ لیا۔ اس کے بیٹے چھلیاں پکڑتے تھے ڈولی کا کام چھوڑ دیا تھا میں اُن کے گھر میں روٹی بچاتی تھی۔

ایک دن رات کو کہار کے لڑکے نے کہا۔ یہ امیر لوگ بھی بڑے آرام سے ہیں۔ دھوپ میں چھلیاں تو ہم پکڑیں اور یہ مزے سے بیٹھ کر کھائیں۔ میں نے کہا دام بھی تو دیتے ہیں اور دام کمانے میں اُن کو تم سے زیادہ محنت اور فکر کا شکار ہونا پڑتا ہو گا۔

کہار یہ سن کر بھگ گیا اور بولا چل ری۔ تو ہماری بات میں دخل دینے والی کون یہ کہار ایک

بائیں میرے سر پر بالامیز پھٹا گیا اور میں بہ ہوش ہو کر گر پڑی۔
ہوش آیا تو دریا کی ریت میں پڑی تھی۔ اور آس پاس کوئی نہ تھا۔ ہلے بھلے کی
طاقت نہ تھی۔ ہندو عورتیں جنہا پر ہانے جا رہی تھیں۔ میں نے ان سے ہاتھ جوڑ کر
کہا۔ مجھے شفا خانہ پہنچا دو۔ میرے چوٹ لگ گئی ہے۔ انہوں نے رحم کھا کے ڈولی
منگوا دی اور میں شفا خانہ آئی۔ وہاں علاج ہوا اور اچھی ہو کر صدر بازار میں پہنچ دی وہاں
ایک پنجابی کے ہاں روٹی پکالنے کی نوکری کر لی۔

غرض اس طرح یہ دن بسر ہوئے پنجابی بھی بہت بد چلن تھا۔ اس کی بڑی تنگاہیں
دیکھ کر میں نکل آئی اور بھیک مانگنے لگی۔ کیونکہ دو چار جگہ نوکری کو کہا تو انہوں نے
ضمانت مانگی۔

ایک دن بھیک مانگ رہی تھی کہ ایک لڑکا روٹی دینے آیا۔ مجھ کو اس کی صورت دیکھ کر
کچھ محبت سی آئی۔ پوچھا تم کون ہو۔ اس نے کہا میری اماں روٹی پکاتی ہیں۔ میں نے کہا
ان کا کیا نام ہے۔ بولار قیہ۔ رقیہ نام سن کر مجھے شک ہوا کہ شاید میری بھی ہیں۔ اندر گھر
میں چلی گئی۔ دیکھا تو واقعی بھیجی جان بھین۔ بھیجی جان نے مجھ کو پہچانا۔ گلے مل کر خوب
زویں اور اپنے پاس بٹھرا لیا۔ چند روز میں نے ان کے ساتھ کام کیا۔ مگر ایک دن اس گھر
میں کچھ چوری جاتا رہا۔ صاحب خانہ نے پولس کو بلا کر کہا کہ یہ اجنبی عورت ہمارے ہاں
آئی ہے اسی کا کام معلوم ہوتا ہے۔ پولس والے مجھ کو کوٹوالی لے گئے اور وہاں مجھ پر تنبیہ
شروع کی۔ ایک نے میری چوٹی پر ہتھ مار کر گھسیٹا۔ اس وقت میں نے آسمان کو دیکھا کہ
میں ہند کے شہنشاہ کی نواسی ہوں میں چور نہیں ہوں۔ مجھے
یہ کیوں ستاتے ہیں۔ ابھی سیرا دنیا میں کوئی حمایتی نہیں۔ میں
کس سے کہوں کہ بقیہ صورت ہوں۔

یہ سوچ رہی تھی کہ باہی نے جو تیاں ماری شروع کیں۔ یہ ذلت ایسی سخت تھی کہ مجھ کو

غش آگیا۔ آخر تھانہ دار نے رحم کھا کے مجھ کو چھوڑ دیا۔ اور میں بھیک مانگتی مانگتی آپ کے
ہاں آگئی۔

پیر جی گھسیاے

میں نے ماما اور حال کی بیگم کا یہ افسانہ سُکر ٹھنڈا سا نس بھرا اور کہا دنیا میں بھی
کیا کیا انقلاب پیش آتے ہیں۔ گردِ نیا والے ذرا نہیں گھبراتے۔ نہ اچھے وقت کا کچھ اعتبار
ہے نہ بُرے وقت کا۔ ایک سا وقت کسی کا نہیں رہتا۔ انسان کو نہ خوشی میں اترنا چاہیے
نہ تکلیف میں گھبرانا۔

چندر وزہم بہت ہنسی خوشی سے رہے۔ مگر اتنے میں میرے مکتب کی نوکری جانی رہی
ذرا سے قصور پر مجھ کو قون کر دیا گیا۔ لڑکوں نے بھی جو میرے پاس پڑھنے آتے تھے آنا
چھوڑ دیا۔

اب پھر معاش کی تنگی ہوئی، جگہ جگہ نوکری کی تلاش کو گیا۔ مگر کہیں دستیاب نہ ہوئی
اسی حالت میں ایک دن میں درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء میں زیارت کو گیا
والہی میں دیکھا کہ ایک گھسیار اٹھوڑے پر گھاس لے دے چلا جاتا ہے۔ میں نے راستہ کاٹنے
کو اُس سے باتیں شروع کیں۔

پوچھا کیوں بھئی۔ یہ گھاس کتنے کو بک جائیگی۔ اُس نے کہا تین سارے تین روپیہ کو
مجھے بہت تعجب ہوا۔ میں نے کہا افوہ اس میں تو بڑا نفع ہے۔ گھسیارے نے کہا محنت
بھی تو ہے۔ صبح چار بجے گیا تھا اب چار بجے شام تک اتنی جمع ہوئی ہے۔ میں نے کہا جنگل
سے مفت لاتے ہو یا کچھ دینا پڑتا ہے۔ اس نے کہا چالینس روپیہ کا ایک جنگل ٹھیکہ پر لیا ہے
وہیں سے لاتا ہوں۔ ایک جنگل چھڑھینے کو کافی ہے۔ ایک رُخ سے کھودتا ہوں دوسرے
دن دوسری جانب سے تیسرے دن اور طرف سے۔ اس طرح یہ پھیر بندھا رہتا ہے۔ کہ جب

اول دن کی کھدائی ہوئی زمین کو آٹھ دن ہو جاتے ہیں تو نئی گھاس پیدا ہو جاتی ہے اور میرا رزق از سہر نو وہاں سے شروع ہوتا ہے۔ آٹھ آنے روز گھوڑے کا خرچ ہے تین روپیہ کا مکان ہے باقی گھر کے کام آتا ہے۔ میں اکیلا ہوں ایک بیوی ہے۔ اگر بچے بھی ہوتے تو اتنی محنت نہ ہوتی۔ کچھ وہ کھودنے کچھ میں۔ دوپہر سے پہلے گھوڑے کا بوجھ ہو جاتا یہ سنکر میں گھر آیا اور سارا حال بیوی سے کہا۔ اُس نے کہا گھاس کھودنے میں کچھ عیب نہیں بڑے بڑے زرگوں نے یہ پیشہ کیا ہے۔ یہ سوچ کر میں نے بیوی کا نہور بیچ کر ایک ٹوٹا خریدا۔ جنگل جا کر ایک زمین ٹھیکہ پر لی۔ تین کھڑے خریدے اور بچوں کو لیکر گھاس کھودنے گیا۔ چند روز تو ذرا مشکل رہی مگر پھر عادت ہو گئی۔ اب ہم تینوں باپ بیٹے دوپہر سے پہلے گھوڑا بھرتے ہیں اور گھاس کی منڈی میں دوکاندار کے ہاتھ جس سے ٹھیکہ ہو گیا ہے کھڑے کھڑے تین روپیہ کو گھاس فروخت کر کے گھر آ جاتے ہیں۔ پھر میں مسجد میں جاتا ہوں اور شام تک اللہ اللہ کر کے گن رہتا ہوں۔ سینکڑوں عورت مرد تعویذ گنتے کو آتے ہیں اور میں ان کو تعویذ مفت تقسیم کرتا ہوں۔ جس میں اللہ اثر دیتا ہے۔

لوگ میرے پیٹ سے آگاہ ہیں اور بجائے نفرت کرنے کے سمجھتے ہیں کہ میں کوئی بڑا پہنچا ہوا فقیر ہوں۔ جو اکل حلال کے لئے گھاس کھودتا ہوں۔ اس واسطے اُن کے دل میں میری بڑی عزت و قدر ہے ۷۵ روپیہ ماہوار اس پیشہ میں ملے ہیں۔ اور کالج کے بی۔ اے پاس لوگوں سے میری اچھی گزر جاتی ہے جنکو ۲۵ روپیہ کی غلامی بھی نصیب نہیں۔

نوال فسانہ

ٹھیکہ والا شہزادہ

۱۹۱۷ء کے درہار میں دہلی کے دن پھر نئے شہر کی تیکریاں شروع ہوئیں نئے

بنے۔ نامور انجنیروں کی دماغ آرمیاں اپنے جوہر دکھانے لگیں۔ شاہان اودھ کے موٹ
منصور علی خاں صفدر جنگ کے مقبرے کے آس پاس گما اینٹ بنانے اور پکانے کے
کارخانے جاری ہوئے۔ ہزاروں غریبوں کا روڈ گاڑ چکا پکی ہوئی اینٹوں کے انبا
ریل گاڑیوں اور ٹھیلوں میں سوار ہو ہو کر امپیریل سٹی (شہنشاہی شہر دہلی) کی تعمیرات
میں جانے لگے۔

۱۱ مئی ۱۹۱۷ء کا ذکر ہے۔ ٹھیک دوپہر کی دھوپ اور حواس کھونے والی گرمی
میں ایک بوڑھا ٹھیلہ والا خان بہادر سیٹھ محمد ہاروں کے بھٹے سے اینٹیں لیکر دہلی جا رہا
تھا۔ سر پر ہونٹ کی تیز کرنیں سفید ڈاڑھی اور مونچھوں پر راستہ کا گرد و غبار۔ پیشانی پر
پسینہ جس میں اینٹوں کی سرخ جی ہوئی۔

پیچھے سے ایک موٹر غالباً قطب صاحب سے آ رہی تھی۔ ڈرائیور نے ہر چند بگل
بجایا مگر بوڑھے اور بہرے ٹھیلہ والے نے اُسکی آواز نہ سنی اور ٹھیلہ کو سڑک سے نہ ہچایا
موٹر قریب آئی اور ٹھیلہ سے ٹکرائی۔ ڈرائیور بہت ہوشیار تھا فوراً موٹر کو روک لیا اور
ٹھیلہ کی ٹکر سے موٹر کو کچھ نقصان نہ پہنچا۔

اس موٹر میں ایک پنجابی سوداگر جوانی اور شراب کے نشے میں چور کسی بازاری عورت
کو لئے بیٹھا تھا۔ ٹھیلہ والا کو غریب بوڑھا اور کمزور دیکھ کر غصہ سے بتیاب ہو گیا ہاتھیں
بطور فیشن کے ایک کوڑا تھا۔ اُسی کو لیا۔ موٹر سے اُترا اور پچارے ٹھیلہ والے کو مارنے لگا
ٹھیلہ والا اکبلا تھا۔ ضعیف اور ناتوان تھا اور سب سے بڑا کہ یہ کہہ مفلح ورنادار
تھا۔ مگر خیر نہیں دل میں کیا ہمت اور جرات رکھتا تھا کہ چار کوڑے تو پہلے حملے میں سے
کھائے لیکن پھر بیل ہانکنے کا چابک لیکر اس نے بھی اس مخمور نوجوان پر حملہ کیا اور
چابک کے باتس کا وڈنڈا ایسا مارا کہ شرابی عیاش کا مغز پھٹ گیا۔ موٹر ڈرائیور نے
چاہا کہ وہ اس بوڑھے کو سزا دینے کو آگے بڑھے۔ مگر قدم بڑھانے سے پہلے ہی چابک

کی لکڑی اُس کے سر پر بھی پڑی جس نے اُس کا چہرہ بھی خون سے لال کر دیا۔ موٹر نشین ہوا
نے گھبر کر رونام شروع کیا اور بلبلا کر چیخی کہ خدا کے لئے تم موٹر میں آ جاؤ۔ ورنہ یہ گنوار
تم کو جان سے مار ڈالے گا۔

یُنکر جو ان اور موٹر بان دونوں موٹر میں بیٹھ گئے اور ٹھیلہ والے کو گالیاں دینے لگے
بوڑھا خاموش کھڑا مٹکراتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ بس ایک ہی وار میں بھاگ نکلیے۔ تیموری
طمانچہ کھانا آسان نہیں ہے۔

ٹھیلہ والا اس قدر بہرا تھا کہ موٹر والوں کی گالیاں اُس نے نہ سُنیں اور پھر ٹھیلہ
پر آن بیٹھا۔ موٹر بھی دہلی چلی گئی اور ٹھیلہ بھی رسی نہ دہہ مقام جہاں نئی دہلی کی تعمیر
ہو رہی ہے) میں اینٹیں ڈالنے روانہ ہو گیا۔

(۲)

رسی نہ کے تھانے میں دوسرے دن دوزخ نما اور چند ٹھیلے والے جمع تھے وہ بوڑھا
ٹھیلے والا بھی کھڑا تھا۔ داروغہ پولس نے پوچھا کیا تم نے ان کو زخمی کیا ہے؟
بوڑھا چپ کھڑا رہا۔ داروغہ نے پھر ذرا بگڑ کر سوال کیا اور کہا بولنا کیوں نہیں
دوسرے ٹھیلے والے بولے حضور یہ بہرا ہے۔ تب ایک سپاہی نے بوڑھے کے کان کے
پاس جا کر آواز سے یہی سوال کیا تو بوڑھے نے جواب دیا ہاں مرنے مارا ہے۔ انھوں
نے پہلے مجھ پر حملہ کیا چار کوڑے مارے تو میں نے بھی جواب ترکی بہ ترکی دیا۔ یہ میر
لوگ غریبوں کو کھاس پھوس سمجھتے ہیں۔ آج سے ساٹھ برس پہلے ان زخمیوں کے ماں
باپ میرے غلام تھے۔ اور یہی نہیں سارا ہندوستان میں محکوم و تابع رہا تھا۔

داروغہ پولس ہنسنا اور اُس نے کہا شاید یہ پاگل ہو گیا ہے بڑھاپے نے اس کی
عقل کو مادی۔ اچھا اس کو حوالات میں لیجاؤ۔ کل عدالت میں چالان جائے گا۔ ایسے
دیوانہ کو پاگل خانہ بھیجا جائے۔

(۳۷)

بڑی مجسٹریٹ کے ہاں پوڑا بٹھیلہ والا پولس کی حراست میں حاضر تھا اور دونوں ہی
بھی موجود تھے کورٹ انکپٹر نے واقعات پیش کئے تو عدالت نے مدعا علیہ کا بیان
لینا چاہا اور یہ معلوم کر کے کہ وہ بہرہ ہے چر اسی نے چنچ چنچ کر اس کا اظہار لیا
پوڑے نے بیان کیا۔

میرا نام ظفر سلطان ہے۔ میں میرزا بابر برادر بہادر شاہ بادشاہ کا بیٹا ہوں
میرے دادا ہندوستان کے شہنشاہ معین الدین اکبر شاہ ثانی تھے۔ عدو کے بعد میں انہوں
پریشانیوں کے بعد ملکوں ملکوں پھرتا ہوا دہلی میں آ گیا۔ اور بٹھیلہ چلانے کا کام کرنے لگا
۱۱۰۰ھ میں ۱۹۱۰ء جو ۱۱۰۰ھ میں عسکری طرح گرم اور سخت تھی اس واقعہ کی تاریخ ہے
میں بہرا ہوں۔ میں نے سوڑکی آواز نہیں سنی۔ موڑ والوں نے میری عمر اور حالت پر رحم
نہ کیا۔ اور میرے چار کوڑے مارے میرے بدن میں جو خون ہے اُسکو مار کھانے کی اور
ظلم و جور پہنے کی اب تو عادت ہو گئی ہے مگر پہلے نہ تھی جس جگہ عدالت کی کرسی ہے اسی
مقام پر عدو سے پہلے میرے حکم سے بارہا بہت سے شہریوں اور سرکشوں کو سزائیں
دی گئی ہیں۔ میرے دل و دماغ نے ان عادتوں کو فراموش نہیں کیا۔ گو میری آنکھوں
نے ان نظاروں کی دید مدت سے ترک کر دی ہے۔ میں کیونکر چار کوڑوں کو برداشت
کر سکتا تھا۔ میں نے بیشک بدلہ لیا۔ اور ان دونوں بہادر چوٹوں کے سر چاڑ ڈالے
اگر آپ شریف لوگوں کا انصاف کرنا چاہتے ہیں تو میں آپ کے فیصلہ کے سامنے
سر جھکانے کو تیار و آمادہ ہوں۔“

پوڑے کی تقریر سن کر عدالت میں تٹا اٹھا گیا۔ مجسٹریٹ صاحب جو یورپین
تھے ظلم میں لیکر پوڑے کو دیکھنے لگے اور ان کا مسلمان منہ دار آنکھوں میں آنسو
بھرا لیا۔ دونوں مدعی بھی یہ بیان سن کر دم بخود رہ گئے۔

عدالت نے حکم دیا۔ تم کو رہا کیا جاتا ہے۔ اور مدعیوں پر دشن دشن روپے جرمانہ کیونکہ خود ان کے بیان سے ظاہر ہے کہ انہوں نے نشہ کی حالت میں پہلے جاعلیہ پر حملہ کیا تھا۔

اس کے بعد مجسٹریٹ نے چراسی کے ذریعہ بوڑھے شہزادے سے پوچھا کیا تمہاری پنشن سرکار سے مقرر نہیں ہوئی۔ تم ٹھیکہ کا ذلیل کام کیوں کرتے ہو۔

شہزادہ نے جواب دیا مجھے معلوم ہے کہ انگریزی سرکار نے ہمارے خاندان والوں کی پانچ پانچ روپے ماہوار پنشن مقرر کر دی ہے مگر میں اول تو برسوں دہلی سے غیر حاضر رہا اس کے علاوہ جب تک ہاتھ پاؤں چلتے ہیں کام کر کے محنت کی روٹی کافی فرض سمجھتا ہوں۔

جناب! مجھ کو ٹھیکہ میں تین چار روپے روزانہ مل جاتے ہیں دو روپے روز روپیوں وغیرہ کا خرچ ہے جس میں گھر کا کرایہ بھی شامل ہے اور روپیہ دو روپیہ مجھ کو بچ جاتے ہیں۔ میں پانچ روپیہ ہینڈ لیکر کیا کرتا۔ آج کل میں بہت خوش ہوں اور مجھ کو ہر طرح کی آزادی اور بے فکری ہے جو لوگ آپ کی کھربوں میں لوگ ریاں تلاش کرتے پھر تہیں اور بی۔ اے۔ ایم۔ اے پاس ہونے میں غریب بے باک کرتے ہیں ان سے مجھ ٹھیکہ والے کی حالت لاکھ درجہ بہتر ہے۔ ٹھیکہ چلانے میں کچھ ذلت نہیں ہے کیونکہ میں بیلوں پر حکومت کرتا ہوں اور خود بیل بنکر محکوم نہیں بنتا۔

(۴)

ٹھیکہ والا شہزادہ پہاڑ گنج کی مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا۔ اور اسی کے قریب اسکا گھر تھا جب وہ نماز پڑھ چکا تو ایک شخص اُسکے پاس گیا اور کہا میں آج کچھری میں جو د تھا اور میں نے آپکے بیان کا چرچا سنا تھا۔ کیا آپ مجھ کو غدر کے حالات سناسکتے ہیں کہ آپ غدر میں درائس کے بعد کہاں کہاں رہے اور آپ پر کیا کیا مصیبت پڑی۔

بھیٹلے والے نے مسکرا کر کہا کیا آپ وہ حالت سن سکتے ہیں۔ اور کیا آپ کو ان جھوٹی باتوں پر یقین آ سکتا ہے۔ کیونکہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو بات گذر جائے خواہ وہ خوشی کی ہو یا تکلیف کی ہو جھوٹی ہے اُسکا بیان کرنا جھوٹ بولنا ہے۔ آئیوالا زمانہ وہم ہے۔ گزرنے والا وقت جھوٹا ہے اور موجودہ گھڑی سچی ہے میرا خیال تو یہ ہے کہ جو وقت سامنے ہے اُس پر یقین کروں اور ہنسی خوشی اُس کو گزار دوں۔ نہ گزری وقت کی یاد دل میں آئے دوں۔ نہ آئیوالے زمانہ کا فکر ذہن میں لاؤں بس جو کچھ سمجھوں اسی وقت کو سمجھوں جو آنکھوں کے نظر آتا ہو۔ اور جس میں موجودہ سالس کی آمد و رفت ہو۔

سائل نے کہا یہ تو آپ کی ذاتی تجربہ کی باتیں ہیں۔ آپ کے دل کو صدموں اور حادثوں نے دنیا سے اوداس کر دیا ہے۔ مگر میں تو واقعات غدر کی یادداشت مرتب کرنے کو آپ سے یہ حالات پوچھتا ہوں۔ میں نے اور بھی اسی طرح بہت سے واقعات جمع کئے ہیں۔ اور آپ بتی کیفیت شہزادوں سے پوچھ پوچھ کر لکھتی ہے۔

یہ مسکرا کر شہزادہ نے زور سے قہقہہ لگایا اور کہا شاید آپ اخبار والے ہیں۔ میں اُن لوگوں سے سخت بیزار ہوں۔ یہ بہت ہی جھوٹ بولا کرتے ہیں۔ اچھا آپ میرے گھر پر چلے میں جہان کی دشمنی نہیں کرؤں گا۔ اور آپ جو پوچھیں گے بتاؤں گا۔

شہزادہ سائل کو لیکر اپنے گھر میں گیا۔ چھپر کا ایک مکان تھا۔ باہر صحن میں دو بیل اور ایک گائے بندھی ہوئی تھی اندر دالان میں ایک تخت بچھا ہوا تھا برابر ایک پلنگ تھا دونوں پر سفید چاندنیاں بچھی ہوئی تھیں۔ جن سے غریب مگر محنتی اور کماد شہزادہ کی نفاست مزاجی ظاہر ہوتی تھی۔ شہزادہ نے سائل کو تخت پر بٹھایا اور خود باورچی خانہ سے کھانا لایا۔ اور کہا آؤ پیٹلے کھانا کھاؤ۔ پھر باتیں کریں گے۔ کھانا اگرچہ ایک آدمی کا تھا مگر دو قسم کا سالن۔ دال چٹنی اور کچھ مٹھاس اس بات کو ظاہر کرتی تھی کہ شہزادہ اس حالت میں بھی مرکلف زندگی بسر کرتا ہے۔ سائل نے ہر حیدر عذر کیا

مگر شہزادہ نہ مانا اور دونوں نے کھانا کھایا۔ اور پھر شہزادہ نے خود حقہ پھرا اور سائل کے آگے رکھا۔ اس نے حقہ نہ پینے کا عذر کیا۔ تو شہزادہ نے کلی کو آگے رکھ کر یہ داستان کہنی شروع کی۔

(۵)

میں میرزا بابر کا بیٹا ہوں۔ میرزا بابر بہادر شاہ کے بھائی تھے۔ غدر سے پہلے بہادر شاہ کی حکومت تو ہندوستان میں نہ تھی۔ مگر عنت بادشاہوں کی سی ہر صوبہ۔ ہر شہر اور ہر آبادی میں ان کے نام کی کجیائی تھی۔ اور دہلی میں تو ہر شخص بہادر شاہ اور ان کے خاندان کا وہی ادب و لحاظ کرتا تھا جو شاہ جہاں اور عالمگیر کے وقت میں ہوتا تھا میں اپنے باپ کا بہت لاڈلا بیٹا تھا۔ اگرچہ ان کے اولاد اور بھی تھی۔ مگر اپنی ماں کا میں اکلوتا تھا۔ میرے والد کا غدر سے پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ جب غدر پڑا اور باغیوں کی فوج دہلی میں گھسی۔ تو جیسی ستم کاریاں اس نے انگریزوں اور ان کی عورتوں اور بچوں پر کیں ان کے کہنے سے کلیجہ کا پتا ہے۔ اس کے بعد جب انگریز پنجاب کی مدد لیکر دہلی پر آئے اور اس کو مغلوب کر لیا تو بادشاہ سمیت سارا شہر بھاگ نکلا۔ میری والدہ نابینا تھیں اور آئے دن کی بیماریوں سے بہت کمزور ہو گئیں تھیں۔ رتھ میں سوار ہونا بھی ان کو دو بھر تھا۔ مگر دو عورتوں کی مدد سے میں ان کو سوار کیا اور خود بھی اُس میں بیٹھ کر دہلی سے نکلا۔ بادشاہ وغیرہ تو مقبرہ ہمایوں گئے تھے مگر میں نے کرنال کا رخ کیا کیونکہ وہاں میرے ایک دوست رہتے تھے جن سے دہلی میں اکثر ملاقات ہوا کرتی تھی اور وہ کرنال کے علاقہ میں صاحب حیثیت زمیندار تھے۔

ہمارا رتھ اجیری دروازہ سے باہر نکلا (راستہ تو لاہوری دروازہ سے تھا مگر اُدھر انگریزی فوج کا ڈر تھا) تو دیکھا ہزاروں آدمی عورت مرد بچے بوڑھے بچیاں سروں پر کسے حیران پریشان چلے جا رہے ہیں۔ رتھ والے نے کہا گوڑا گناؤں ہو کر کرنال چلے

چاہئے۔ تاکہ فوج والوں کے ہاتھ سے امن رہے گا۔ گناہ تک تو ہم امن سے چلے گئے۔
 اگرچہ راستہ میں گوجر وغیرہ ملے۔ مگر ہم چیلے حوالے کر کے ان کے ہاتھوں سے بچ گئے۔ لیکن
 گناہ گناہ سے جب کرنال کی طرف مڑے تو دو کوس کے بعد پہی گوجروں کے ایک غول
 نے رتھ کو گھیر لیا اور لوٹنا چاہا۔ ابھی انہوں نے ہاتھ نہ ڈالا تھا کہ سامنے سے ایک
 انگریزی فوج کا دستہ آگیا۔ یہ سب گورے تھے۔ ان کو دیکھ کر گوجر تو بھاگ گئے اور گورے
 گھوڑے دوڑا کر رتھ کے پاس پہنچے۔ اور انہوں نے مذاق کے انداز سے انگریزی زبان
 میں کچھ کہنا شروع کیا۔ جس کو میں نہیں سمجھا۔ میں مشرقی رخ تھا۔ مغربی رخ سے ایک
 گورے نے رتھ کا پردہ اٹھا کر دیکھا اور والدہ کو نابینا اور بڑبھیا دیکھ کر قہقہہ لگایا
 اور اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا جس کو منکر وہ سب آگے بڑھ گئے اور ہکو کچھ تکلیف نہ دی۔
 جب وہ چلے گئے تو ہم آگے بڑھے اور شام تک چلتے رہے۔ رات کو ایک گاؤں
 کے پاس قیام کیا۔ وہاں آدمی رات کو چوریل کھول کر لے گئے۔ رتھ بان بھی کہیں با
 ہو گیا صبح کو میں بہت فکر مند ہوا اور گاؤں والوں سے جا کر کرایہ کی گاڑی مانگی
 یہ جاٹ تھے۔ ان کا چودھری میرے ساتھ آیا اور بولا گاڑی تو ہمارے گاؤں میں
 نہیں ہے۔ تم اپنی ماں کو ہمارے گھر میں ٹھیرا دو۔ دوسرے گاؤں سے گاڑی منگوائی
 میں نے اس کو غنیمت سمجھا اور والدہ کو لیکر چودھری کے گھر میں چلا گیا۔ ہمارے پاس
 ایک پٹاری تھی اور ایک صندوقچہ اور ان دونوں میں اشرفیاں اور جڑاؤ دیور تھا
 چودھری نے گھر میں اتار کر اور سب ماں رکھ کر ایک آدمی کو دوسرے گاؤں
 سے گاڑی کے لئے بھیجا۔ بخوڑی دیر میں گاؤں والوں نے غل حجابا کہ انگریزی فوج
 آتی ہے۔ چودھری میرے پاس آیا۔ اور کہا جاؤ تم گھر سے بھاگ جاؤ۔ ورنہ ہم بھی
 تمہارے ساتھ مارے جائیں گے۔ میں بہت گھبرایا اور چودھری سے کہنے لگا کہ اندھی
 ماں کو لیس کر کہاں جاؤں۔ تم کو میرے حال پر ترس نہیں آتا۔ یہ منکر اس جاٹ نے میرے

ایک مکہ مارا اور کہا ہم تیرے لئے اپنی گردن کٹوا دیں۔ میں نے بھی اسکے پیچھے بھاگ دیا۔ یہ دیکھتے ہی جاٹ جمع ہو گئے۔ اور ان سب نے ملکر مجھ کو خوب مارا۔ اور میں بیہوش ہو کر گر پڑا۔ ہوش میں آیا تو ایک جنگل میں پڑا تھا۔ اور والدہ میرے سر ہالے بیٹھی رو رہی تھیں۔ والدہ نے کہا وہ جاٹ تجھ کو اور مجھ کو ایک چار پائی پر اٹھا کر یہاں ڈال گئے ہیں معلوم ہوتا ہے اُنھوں نے اسباب لہٹنے کا یہ بہانہ کیا تھا فوج و فوج کچھ نہ آئی تھی۔ سردہ بڑا کٹھن وقت تھا۔ جنگل بیا بان دھوپ کی شدت ایک میں ایک میری ٹانگہ آنکھوں سے محتاج ماں۔ چاروں طرف سناٹا اور دشمنوں کا ڈر۔ راستہ کی بے خبری اور زخموں کی دُکھن سونے پر بٹھا کر۔ والدہ نے کہا۔ بیٹا چلو۔ بہت کر کے آگے بڑھو۔ یہاں جنگل میں پڑے رہنے سے کچھ فائدہ نہیں میں کھڑا ہو گیا۔ سر میں اور بازو پر زخم تھے پیروں پر بھی چوٹ آئی تھی۔ نراندھی ماں کا ہاتھ پکڑا کے راستہ چلنا شروع کیا کلنے ڈالے جھاڑیاں سارے میدان میں پھیلی ہوئی تھیں جنھوں نے بدن کے کپڑے بھاڑ ڈالے اور پیروں کو لہو لہان کر دیا۔ والدہ ٹھوکریں کھا کھا کر گر پڑتی تھیں اور میں ان کو سنبھالتا تھا۔ گرزخوں کی کمزوری سے مجھ میں بھی چلنے کی بہت نہ تھی۔ دو وقت سے بھنے کچھ کھایا بھی نہ تھا۔ غرض ایسا وقت کہ خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔

جب دوپہر کا سورج سر پہ آیا تو میرے سر کے زخم میں ایسی تکلیف ہوئی کہ میں چکر کر گر پڑا۔ ہوش تھا مگر اٹھنے اور چلنے کی طاقت نہ تھی والدہ نے میرا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور یہ دعا مانگنی شروع کی۔

ابھی مجھ پر رحم کر میرے گناہوں کو معاف کر دے اور میرے بچے کی جان کو بچالے۔ خدا یا یہ اندھی شہزادی تیرے آگے ہاتھ پھیلاتی ہے اسکو محروم نہ کر۔ بہار تیرے سوا کوئی نہیں ہے۔ آسمان زمین ہمارے دشمن ہیں۔ تجھ بن کر کس سے کہوں۔ تو جسکو

چاہے عزت دے جسکو چاہے ذلت دے کل ہم ملکوں اور
ہاتھی گھوڑوں اور لونڈی غلاموں کے مالک تھے آج انہیں
سے کچھ بھی ہمارے پاس نہیں۔ کس برتنے پر دنیا والے اس
فانی جہان میں جینے کی آرزو کرتے ہیں۔

توبہ ہے۔ گناہوں کی توبہ ہے۔ رحم۔ رحم۔ اے خدا رحم۔

اماں دعا مانگ رہی تھیں۔ کہ ایک گنوار اُدھر اُٹکلا اور اُس نے کہا۔ بوڑھیامیرے
پاس جو کچھ ہو والدے۔ والدہ بولیں بیٹا میرے پاس تو سوائے اس زخمی بیمار کب کچھ
بھی نہیں ہے۔ پھر شکر اُس گنوار نے ایک لٹھ والدہ کے سر پر مارا۔ لٹھ کے پڑنے ہی
والدہ کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ اور اُنھوں نے کہا ہائے ظالم میرے بچے کو نہ مارو
میں ہمت کر کے اُٹھا مگر پھر جگر گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔ گنوار نے میرے اور
والدہ کے کپڑے اُتار لئے مجھے ہوش آیا تو گنوار چلا گیا تھا۔ اور ہم دونوں بالکل
برہنہ پڑے تھے۔ والدہ دم توڑ رہی تھیں۔ میں نے ان سے پوچھا۔

اماں کیا حال ہے۔ اُنھوں نے اُکھڑی اُکھڑی آواز میں کہا۔ میاں مرنے ہوں
میاں کو خدا کے سپرد۔ آہ کفن بھی میسر نہ آیا۔ ارے گور بھی نہ ملے گی میں شہنشاہ ہند
کی بھانج ہوں۔ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللَّهِ۔ کہا اور مر گئیں۔ میں نے وہیں سے
ریتا سمیٹا اور اس بگیں کی لاش کو خاک میں چھپا دیا۔ اور خود بھی بمشکل گھسٹ
گھسٹ کر ایک درخت کے نیچے جا کر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر میں ایک فوجی سوار
وہاں سے گذرا اور مجھ کو دیکھ کر قہر پہ آیا۔ میں نے سارا حال اس سے کہا
اُس نے کمر کا رد مال کھول کر مجھ کو دیا جس سے میں نے تہ بند باندھا۔ اس کے بعد
اس سوار نے مجھ کو اُٹھا کر گھوڑے پر اپنے پیچے بٹھالیا۔ اور اپنی جھانڈی میں
لیگیا۔ وہاں اُس نے میرا علاج کرایا جس سے میرے زخم اچھے ہو گئے۔ پھر میں

اس کی خدمت کرنے لگا۔ یہ مسلمان سوار بہت ہی نیک مزاج تھا۔ اس کا مکان
پٹیلہ میں تھا۔ اس کے ہمراہ کچھ دن تو میں پٹیلہ میں رہا اور پھر فقیر ہو کر شہر بہشہر
پھرنے لگا جب بمبئی پہنچا تو خیراتی قافلہ کے ساتھ مکہ معظمہ چلا گیا۔ اور وہاں سے
برس گزرے۔ پھر مدینہ شریف حاضری دی۔ اور وہاں بھی پانچ برس بسر کئے اسکے
بعد شام اور بیت المقدس کی زیارتیں کر کے حلب ہو کر بغداد شریف گیا۔ دو
سال وہاں کاٹے۔ بغداد سے ایک مہین کے ہمراہ کراچی آیا اور وہاں سے دہلی
آگیا۔ کیونکہ دہلی کی یاد بخوبی ہر جگہ بچپن رکھتی تھی۔

یہاں ریل پر میں نے مزدوری کرنی شروع کی۔ جس میں مجھ کو کھانے پینے کے
بعد کچھ بچت ہونے لگی۔ اور دو سال میں میرے پاس تین سو روپے ہو گئے
تو میں نے ایک ٹھیلہ والے کی شرکت میں ٹھیلہ بنایا اور اس کی آمدنی سے آہستہ
آہستہ سا جھگی کا حصہ ادا کر کے اپنا مستقل ذاتی ٹھیلہ بنالیا۔ اور اب اسی پر
میری گذر اوقات ہے۔

سائل نے کہا۔ بہراپن کب ہوا۔ اور اس سے تو آپ کو تنہائی میں بہت تکلیف
اٹھانی پڑتی ہوگی۔ شہزادہ نے منس کر جواب دیا۔ خدا کا شکر ہے کچھ تکلیف
نہیں ہوتی۔ سارے جہان کے عیب سننے سے کان بند ہیں۔ گاؤں میں جب
جاؤں نے مارا تھا۔ اسی وقت دماغ پر ایسی چوٹ آئی تھی جس سے کان کی
قوت جاتی رہی اب صرف بائیں کان سے کچھ سن سکتا ہوں۔ دایاں بالکل بیکار ہے
سائل نے یہ ماجرا سن کر کہا کیا میں اس کو اپنی کتاب میں لکھ دوں
شہزادہ نے کہا ضرور لکھ دو مگر یہ بھی لکھ دینا کہ

ہر گزرنے والی بات اور ہر گزرنے والا وقت اور ہر
گزرنے والی راحت و تکلیف جھوٹی اور بے اصل ہے

مگر اس میں عبرت ضرور ہے ۱۸

دسواں فسانہ فقیر شہزادہ کی دولت عطر اور دوانڈے

تم ہیرے کو چاہو بیوتی پر جان دو۔ سونے چاندی کو سرمایہ زندگی سمجھو۔
شال دو شالے۔ زرہ بفت۔ کم خواب سے جی لگاؤ۔ ہاتھی، گھوڑے، پالکی، نالکی
محل سوئی کو ضروری خیال کرو۔ تمکو مبارک۔ مگر دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں۔ جو ان
مٹنے والی چیزوں کو دو کوڑی کا سمجھتے ہیں۔ اور آخرت کی نعمتوں کے آگے دنیا کی
ان بہاروں کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے۔

خدا اپنی محبت جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ اس میں میر غریب بڑے چھوٹے
کبین شریف کی قید نہیں ہے۔

دہلی کا قلعہ آباد تھا۔ تیموری بادشاہ زندہ تھے اس وقت کا ذکر ہے۔ بہادر
شاہ بادشاہ کے عزیزوں میں ایک شہزادہ کو اللہ اللہ کرنے کی لگن لگ گئی۔ گھڑیاں
خدا نے تو نڈھی غلام نوکر چاکر ہاتھی، گھوڑے سب کچھ دیا تھا۔ مگر یہ اللہ کا بندہ
سب سے الگ مکان کے ایک کونے میں پڑا رہتا۔ دو جگہ روٹیاں اس وقت
دو اس وقت کھاتا۔ مٹی کے آبخورہ میں پانی پیتا۔ اور بادق میں مصروف ہو جاتا۔

البتہ صاف کپڑے اور عطر کا بہت شوق تھا۔ ایک صندوقچہ میں طرح طرح
کے عطر بھرے رکھے رہتے تھے۔ جن سے ہر نماز کے وقت ایک نئے عطر سے کپڑے

ساتے اور خدا کے سامنے مسطر ہو کر ہاتھ باندھتے۔
دنیا میں ان کو اولاد سے۔ مال سے، کنبہ سے۔ رشتہ سے محبت نہ تھی پس دو
چیزوں پر جان دیتے تھے۔ ایک عطر اور ایک سبز وار مرغی کا جوڑا۔
عبادت سے فارغ ہوتے تو باہر آکر سبز وار مرغی کے جوڑے کو دام پانی دیتے
اس کو دیکھ کر کبھی ہنستے۔ کبھی روتے شاید ان کو خدا کی قدر میں یاد آتی ہوگی۔ اور وہ
ان مرغیوں میں کوئی جلوہ الہی مشاہد کرتے ہونگے۔

غدر کی بھاگڑ

جب شہزادہ کا غدر پڑا۔ اور سب بلی والے شہر سے نکلے۔ بادشاہ اور ان کی بیگمات
و شہزادوں نے بھی قلعہ چھوڑا۔ تو یہ فقیر شہزادہ بھی مصلّا بغل میں دبا کر کھڑے ہو گئے۔ لوگوں
نے عرض کی۔ جواہرات اور اثرفریاں ساتھ لے لیں۔ بولے یہ سب کچھ تم کو بخشا۔ ہم کو کبھی
چیز کی ضرورت نہیں۔ اللہ کا نام کافی ہے۔ یہ کہا اور اپنا عطر کا صندوقچہ اور سبز وار
مرغیوں کے دو انڈے لیکر چل کھڑے ہوئے۔

لوگوں نے سمجھایا۔ صاحب عالم یہ کیا غضب کرتے ہو۔ کھانے پینے کا سہارا ساتھ
لینا چاہیے۔ یہ عطر اور انڈے کس کام آئیں گے۔ روپیہ پیسہ لو جس سے گزراوقات ہو۔ مگر
انہوں نے کسی کا کہا نہ مانا۔ اُن کے ایک چھوٹی ٹلٹکی اور ایک بیوی تھیں۔ اُن کو
لوگوں کے پُھر دیکھا اور کہا ان کے ساتھ رہو۔ جہاں یہ چاہیں ان کو ساتھ لیجاؤ۔ مگر
میں جو کچھ نقدی ہے لے لو۔ خواہ تم رکھو خواہ ان عورتوں پر خرچ کرو۔ مجھے نہ بیوی
کا ساتھ دینا ہے نہ ٹلٹکی کا۔ اور نہ روپیہ پیسے کا۔

بیمگر اور بیمگر آدمی کی بیٹا

فقیر شہزادہ عطر اور انڈے لے لیکر سیدھے درگاہ حضرت محبوب الہی میں گئے

اور درگاہ کے باہر ایک کھنڈر مکان میں بیٹھ گئے۔ ایک دیسی مرغی کا جو تراخ زید اور وہ دونوں انڈے ان کے نیچے بٹھا دیئے اور یاد حق شروع کر دی کوئی روٹی دے گیا کھالی ورنہ بھوکے پڑ رہے۔ ہاں نماز پڑھتے تو عطر لگا کر پڑھتے۔ کیونکہ ان کے صندوقچے میں عطر بہت تھا۔

نوکر بیگم اور بیگم زادی یعنی ان کی بیوی اور لڑکی کو لیکر گورگاہ کو چلے گئے اور اس کے پاس ٹھہرنے کا قصد میں ایک مکان لے کے رہنے لگے۔

چند روز تو ان نوکروں نے ان بکس عورتوں کی خدمت کی۔ لیکن چونکہ روپیہ سب نوکروں کے ہاتھ تھا ان کو طمع و امنگیں ہوئی اور ایک دن عورتوں کو اکیلا چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اور نقدی ساتھ لے گئے۔

بچاری شہزادی جو سویرے اُٹھیں۔ اور نوکروں کو آواز دی تو کوئی نہ بولا باہر جھانک کر دیکھا تو میدان صاف پایا۔ بہت روئیں۔ ہراساں ہوئیں۔ اپنی نہ کوئی آٹا لائے والا تھا۔ نہ پانی بھرنے والا۔ اور نہ کچھ پاس تھا۔ جس کو خرچ کر کے کچھ منگاتیں

لڑکی کی عمر چھ برس کی تھی اور وہ معصوم جانتی نہ تھی کہ اس پر اور اس کے خاندان پر کیا بلائیں نازل ہو رہی ہیں۔ چار پائی سے اٹھتے ہی سب سے پہلے حوا مانگتی تھی اور بیگم سویرے سے تیار رکھتی تھیں۔ آج نوکر نہ تھے۔ سودا کون لاتا۔ اور صلوہ کہاں سے پکنا لڑکی نے رونامہ شروع کیا۔ وہ چلنے لگی۔ اور اپنی غریب ماں کی پریشانی کو دو گنا کر دیا۔

مایوس بیگم نے بڑوسی کے ایک سقہ کو آواز دی۔ اور اپنے ہاتھ کے طلائی کرٹے دیکر کہا ان کو فروخت کر کے کھانے کا سامان لا دو۔

سونے کے کرٹے دیکھ کر سقہ کے منہ میں پانی بھر آیا چپکے سے لیلے اور دو چار روپیہ کا آٹا۔ گھی شکر وغیرہ لا دی۔ بیگم نے باقی روپے مانگے تو بولا۔ جس بنیہ کے ہاتھ کرٹے بیچے ہیں اس نے باقی دام ابھی دیئے نہیں بیگم خاموش ہو گئی۔

رات کو سقہ نے بیگم کے گھر میں آکر جبکہ وہ سوئی تھیں سارا اسباب کپڑے لئے سمیٹ لئے اور چل دیا۔ صبح کو بیگم اٹھیں تو بہت روئیں۔ محلہ والوں کو پکارا۔ معلوم ہوا سقہ پڑوس سے کہیں چلا گیا یہ کام اسی کا ہوگا۔ اُس وقت اُنھوں نے کڑوں کا حال بھی بیان کیا۔ ایک گھوٹی کی عورت نے ترس کہا کر کہا۔ بیوی اب میں تیرے پاس رہا کر دوں گی۔ تو گجرا مت۔ بیگم کے پاس ان کڑوں کے سوا اور کچھ زیور نہ تھا۔ چند دن تو رکھے ہوئے آئے سے گوارا ہوا۔ اس کے بعد گھوسن نے اپنے پاس سے کھلایا۔

ایک دن گھوسن کے لڑکے نے ننھی بیگم کو دھکا دیدیا جس سے ننھی کی بھوں پھٹ گئی اور بہت خون بہا۔ بیگم کی ایک ہی لڑکی تھی۔ اس نے گھوسن زادہ کو بُرا بھلا کہا۔ اسپر گھوسن بگڑا ہی اور کہا ہمارا احسان کو بھول گئی۔ ہمارے لڑکے کھاتی ہے اور ہمیں کو آنکھیں کھلتی ہے۔ بیگم سے یہ طعنہ نہ مٹا گیا اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

”اری تو مجھ کو کیا روئی کھلائی گی۔ میں اُس باپ کی بیٹی ہوں۔ جو سارے ہندوستان کے راجہ نوابوں کو روئی کھلاتا تھا۔ جس کے دروازہ پر ہاتھی جھولتے تھے۔ جو ہر کیس کا والی اور پشت پناہ تھا۔ آج اگر میں تباہ ہو گئی تو کیا میری شرافت بھی جاتی رہی۔ میں تیرے طعنے نہ مہوں گی۔ اور آج سے تیری روئی نہیں کھاؤں گی۔ تیرے بچے میری لاجا رکھی کو لہو بہان کریں اور میں چکی مٹیھی دیکھوں۔ مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا۔ تو نے جے دن روئی کھلائی ہے میں اس کا بدل کر دوں گی اور جب خدا میرے دن پھیرے گا تیرا نام بوجھ اُتار دوں گی۔“

خواب کا سانپ

اُس دن غم میں بیگم نے کچھ نہ کھایا۔ اور بچی زخم کی تکلیف میں پڑی رہی۔ اُس نے بچکھانے کو کچھ نہ مانگا۔ رات کو بیگم نے خواب دیکھا کہ مجھ کو ایک سانپ نے نکل لیا اور اس کے اندر ایک باغ لگا ہوا ہے۔ باغ میں ایک تخت پر اس کے شوہر فقیر شہزادے بیٹھے ہیں اور ان کی

لڑکی اپنے سر کا زخم ان کو دکھاتی ہے اور کہتی ہے۔ دیکھو آبا گھوسن کے لڑکے نے میرا سر
پھوڑ ڈالا۔

اس پر فقیر شہزادہ نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ دو فرشتے آسمان سے اُترے اور انھوں
نے ایک سائپ لڑکی کے گلے میں ڈال دیا۔ بیگم یہ دیکھ کر ڈریں۔ اور چنچیں۔ ہے ہے میری بچی
یہ کہتے ہی آنکھ کھل گئی۔ تو سنا دو واڑہ پر کوئی کنڈی گھٹکھٹاتا ہے۔ انہوں نے کہا کون ہے
آواز آئی تمہارا خاوند۔

بیگم حیران ہو گئی۔ آواز واقعی فقیر شہزادہ کی تھی۔ کنڈی کھول دی وہ اندر آئے اور کہا
چو گاڑی تیار ہے بیگم نے کہا۔ کہاں چلوں اور تم کہاں سے آگئے۔ اس کا انھوں نے کچھ جواب
نہ دیا لڑکی کو گود میں اٹھالیا اور بیگم کو ساتھ چلے گا اشارہ کیا وہ چپ چاپ انکے ہمراہ
ہو گئیں۔ باہر گاڑی کھڑی تھی اس میں سوار کر کے درگاہ محبوب آباد میں آگئے۔

جب یہاں پہنچے تو ایک مکان میں بیگم اور لڑکی کو اتارا اور غور سے چلے گئے۔ بیگم نے دیکھا مکان
میں ضرورت کی سب چیزیں مہیا ہیں۔ اور ایک صندوق تھرا رکھا ہے۔ اس کو جو دیکھا تو دو ہزار
روپیہ کی اشرفیاں میں بٹھیں۔

بیگم کو بہت تعجب تھا کہ فقیر شہزادہ مہینہ پہنچے۔ اور یہ سب سامان کہاں سے آگیا۔ تو بچی
دیر میں ایک شخص نے آواز دی۔ کہ تمہارے شوہر کا جنازہ تیار ہے۔ لڑکی کو صورت دکھاؤ
تاکہ اس کے بعد ہم ان کو دفن کریں۔ مجھے اور غلجبان ہو کہ ابھی انکو لگئے ہوئے آدمہ گھنٹہ بھی
نہیں ہوا۔ مرکب لگئے۔

بیگم نے پکارنے والے سے کہا۔ تم کون ہو اور میرے شوہر کب مر گئے۔ اس نے کہا
اس کا حال مجھے معلوم نہیں۔ کہ میں کون ہوں فقیر شہزادہ صاحب کی یہ وصیت تھی کہ میں انکی
ہست انکی لڑکی کو دکھاؤں بیگم نے لڑکی کو ساتھ لیا۔ اور غور سے دیکھ کر رونا لپکتی گئیں۔

تھوڑی دیر میں لڑکی واپس آئی۔ اور کہا آبا جانی مر گئے۔ ان کو قبر میں گاڑ دیا۔ لڑکی

کی بات ختم نہ ہوئی تھی کہ وہ شخص پھر آیا۔ اور آواز دی۔ اور کہا۔ مہندہ والی گھوسن کو انجام دیدیا گیا۔ اب اسکا تم پر کوئی احسان باقی نہیں۔

تم کو جب تک یہ بچی جوان ہو چالیس روپے ماہوار خرچ کے لئے ملیں گے اسکے بعد تم مجاؤ گی اور یہ لڑکی اپنے خاوند کے ہاں چلی جائیگی۔

بیگم کو یہ عجیب باتیں برداشت نہ ہوئیں وہ غصہ کھا گئیں۔ اور جب ہوش آیا تو ایک ماما کو بیٹھا پایا۔ جس نے کہا تم میرے ساتھ اور چلو۔ میاں نے وہاں تمہارے لئے گھر لیا ہے۔ اور جا کر میں سارا حال بیان کرونگی چنانچہ بیگم ماما کے ساتھ لوگئیں اور اچھے گھر میں اٹکوا نارا گیا۔ اس وقت ماما نے کہا۔

فقیر شہزادہ صاحب کا ایک روحانی موکل تابع تھا۔ جس دن تمہاری لڑکی کے چٹا لگی۔ اسی دن تمہارے شوہر نے انتقال کیا۔ یہ سارا سامان جو تم نے دیکھا اسی موکل کا ہے اور لو دیکھو کہ میں ہی موکل ہوں تم آرام سے یہاں رہو میں تمہاری خدمت کرونگا اور جب لڑکی کی شادی ہو جائیگی تو میرا کام ختم ہو جائیگا۔

لڑکی کو میں نے ہی اسکے باپ کی میت قبر کے اندر مرحوم کی وصیت کے مطابق دکھائی تھی یہ کہہ کر ماما غائب ہو گئی اور بیگم کو لڑکی کی شادی تک غیبی آدمی خرچ پہنچاتا رہا۔ لڑکی کی شادی کے بعد بیگم مگر گئیں اور غیبی موکل کا کام ختم ہوا۔

گیارہواں فسانہ

دیکھنا شہزادی کی کہانی

ننھی شہزادی کے دو ہاتھ لیڈی ہارڈنگ کی تصویر پر سہیں
تھان۔ یہ صورت انہی دیسرنی کی ہے۔ جنہوں نے ہم کو ایک ہزار روپے دیئے۔

ہاں۔ جی یہ بڑے لاث صاحب کی بیوی کا فوٹو ہے۔ بڑی رحمدل ہیں۔ ہمیشہ غریبوں پر
 ترس کھیا کرتی تھیں۔ اب کے ہم بے سہاروں کا بھی خیال آگیا۔
 ذرا اس تصویر کو مجھے دینا۔ میں ان بیگم کی بلائیں لوں۔ داری جاؤں۔ اور دو باتیں
 کر کے جی کی جڑ اس نکالوں۔

بھوپن کی باتیں

میں صدرتے تم بڑی اچھی آدمی ہو۔ میں قربان۔ کیا نورانی صورت ہے۔ مگر تم ہم غریبوں
 کے جھونپڑے میں کیونکر آتیں۔ ہمارے ہاں تو ٹوٹے پورے کافر ش بھی پورا نہیں ہے میں نکو
 کہاں بٹھاؤں۔ ہم کو چار پائی بھی میسر نہیں۔ ہم سب زمین پر سوتے ہیں۔ یہ بہت ٹھنڈی
 ہے۔ تم کو نزلہ نہ ہو جائے۔ ہمارے مکان کی کڑیاں بھی جھکی ہوئی ہیں۔ ایسا نہ ہو گر پڑیں
 تمہاری کیا خاطر کروں کیا چیز دسترخوان پر چنوں۔ پرسوں سے ہم نے کچھ نہیں کھایا۔ ابا میاں
 بننے لے آتا قرض نہیں دیا۔ اس وقت بھوک کے مارے میری عجیب حالت ہے اگر گھر میں
 کچھ ہوتا تو میں سب تمہارے سامنے رکھ دیتی۔ میں بھوک رہتی تم کو کھلاتی۔ کیونکہ تم نے ہم پر
 احسان کیا ہے۔ اور اس وقت بھوکا دیکھا ہے جبکہ سارا جہان ہم کو بھول گیا تھا۔
 کیوں بیگم! تمہارا جی اس اندھیرے گھر میں گھبراتا تو نہیں۔ تم تو بجلی کی روشنیوں
 میں رہتی ہو۔ کیا کروں۔ آج ہم کو مٹی کا چراغ بھی نصیب نہیں ورنہ اسی کو روشن کر دیتی
 تم کو کہاں سلاؤں رات کیونکر گزرے گی۔ ہمارے پاس فقط دو بچے ہوئے کبل
 میں ایک ابا میاں اوڑھتے ہیں اور ایک میں اماں محکوم ساتھ لیکر سوتی ہیں۔

میرے پیارے لاث صاحب کی بیگم! اچھی ذرا میرے ہاتھوں اور منہ کو دیکھو سردی
 سے پھٹ گئے ہیں۔ سردی کی رایت پہاڑ ہو جاتی ہیں۔ شکم کی نیند ہمارے خوابیں بھی تپتی
 تم نے ہم کو ہزار روپے دیے ہیں۔ میں ہزار ہا اپنے ہاتھوں سے تمہاری چٹ چٹ بلائیں

توں۔ اماں کہتی ہیں۔ ایک زمانہ ہمارا بھی تھا۔ ہم بھی ہزاروں روپے غریبوں محتاجوں کو بانٹا کرتے تھے۔ ہمارے گھروں میں بھی اونی قالین اور مخلی فرش تھے۔ ریشمی زربین پردے تھے سوئے چاندی کی جڑاؤ چھتیں تھیں۔ شال دوشالے تھے۔ لونڈی غلام تھے۔ محل تھے ہندوستان کی شہنشاہی میں داخل تھے۔

ہمارے سامنے بھی گردنیں جھکتی تھیں سدا جہا راجہ اشارہ کے منتظر رہتے تھے۔ ہمارے گھر میں بھی کافی شمعیں روشن ہوتی تھیں۔ ہم بھی لاچار اور بے سہاروں پر ترس کھاتے تھے۔ دوسروں کی خاطر اپنا گھر لٹاتے تھے۔ ہمارے جلوس میں بھی نقارے بجتے تھے نقیب کڑکتے تھے۔ ہاتھی جھوم جھوم کر چلتے تھے۔ ہمارے سر پر بھی تاج تھا۔ تلواریں ہمارے قدموں پر سرٹیک کر چلتی تھیں۔ توپیں ہماری ہوں پر گرن گرن کر برتی تھیں۔

لیکن بیگم اب وہ وقت کہاں ہے۔ دنیا ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے۔

اُونچے اُونچے مکان تھے جہکے بڑے آج وہ تنگ گوریں ہیں پڑے
عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے ہا نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے
گردش چرخ سے ہلاک ہوئے استخراں تک بھی ان کے خاک ہوئے

ذاتِ معبود جاودانی ہے

باقی جو کچھ کہے وہ فانی ہے

خدا نے ہم کو نعمت دی جب تک اُس کے قابل رہے نعمت پاس رہی اور جب ہمارے عمل خراب ہوئے عیش و عشرت میں پڑ گئے۔ ملک سے بے خبر ہو گئے۔ مظلوموں کو بھول گئے۔ ظالموں کی جرب زبانیوں پر پھول گئے۔ خدا نے وہ دولت چھین لی۔ اور دوسروں کو دیدی۔ ہم کو اس میں کسی سے شکوہ نہیں۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔

ہاں تم میری ماں کے برابر بلکہ ان سے بھی بڑی ہو۔ تم سے نہ کہوں تو کس سے کہوں یہاں بھی نہ بولوں تو کہاں زبان کھولوں۔ خدا نے تم کو ہم کا رکھوالا بنایا ہے۔ دیکھو تو

بھوک پیاس بھوکاتی ہے۔ ہمارے ایلچہ دن خاک میں ملائی ہے۔ میری عمر ایسی تھی کہ چہرہ لال ہوتا۔ مگر ناقوں نے زرد کر دیا ہے۔ ہمارے گھر میں عید بقر عید کی خوشی بھی نہیں آتی۔ ہم کوان دنوں میں بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ ہم اس دن بھی ٹوٹی ہوئی جوتیاں اور بیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے ہیں جس دن ساری دنیا اپنی اپنی حیثیت کے جواب نئی جوتیاں اور نئے کپڑے پہنتی ہے۔ کچم برسات کچکے کے کھٹکے رات دن لاتے ہیں بھوک سر دیاں جلائے آتی ہیں۔ ہم پر گرمیاں قیامت ڈھاتی ہیں۔

دلی شہر کے کتے پیٹ بھر کر سوتے ہیں۔ کتے شکم سیر ہو کر گھونسلوں میں جاتے ہیں۔ چڑیوں تک کے واسطے بھی چھتوں کے گھر ہیں۔ گھریاں بھی شاندار مکانات میں رہتی ہیں۔ مگر تیمور بادشاہ کی اولاد۔ شاہجہاں بادشاہ کے بچے۔ جنہوں نے اس شہر کو نسج کیا۔ اور بنایا آدھی روٹی کے ٹکڑے کو ترستے ہوئے بھوکے سوتے ہیں انکو کوئی رات بے فکری کی نصیب نہیں ہوتی۔ جن کے باپ دادا لال قلعہ بنایا تھا۔ ان کو ٹوٹا جھوٹا بھی میسر نہیں آتا۔

بہکارن شہزادی جامع مسجد کی سیر ہوئے

بیگم تم نے دیکھا ہوگا۔ دلی شہر میں ایک جامع مسجد ہے جس کو ہمارے دادا شاہجہاں نے بنایا تھا۔ دوردور کی خلقت اس کو دیکھنے آتی ہے مگر اس کو کوئی نہیں دیکھتا کہ مسجد کی سیر ہوئے کے سامنے پڑے ہوئے برقعہ کے اندر ناتواں بچہ کو گود میں لئے بیوند لگا پا جاوے اور گتھی ہوئی کئے لگی جوتی پہنے کون عورت بھیک مانگتی ہے بیگم نایہ غریب دکھایا ہو۔ شہزادی ہے جس کا کوئی وارث نہیں رہا۔ تم یقین کرنا۔ میری رحمدل ویسراں اسی کے باپ شاہجہاں نے یہ مسجد بنوائی تھی آج پیٹ کے لئے بھیک کے ٹکڑے جمع کر رہی ہے تاکہ زندگی کی مسجد آباد کرے۔ مجھے شرم آتی ہے میں تم سے کہو کہ کہوں کہ یہ ہزار روپے بہت تھوڑے

ہیں۔ مرہم کے ایک چھوٹے سے بچا یہ سے کیا ہو گا۔ ہمارے تو سارے بدن پر زخم ہیں
تمہاری نئی دلی کی خیر جس کی سڑکوں میں لاکھوں روپیہ خرچ ہو رہا ہے۔ تمہاری
نئی عمارتوں کی خیر جس کے واسطے کروڑوں روپیہ کی منظوری ہے۔ تمہارے اس
نیک خیال کی خیر جس کی بدولت دلی کی پُرانی عمارتوں کی مرمت ہو رہی ہے۔ اور
بے شمار روپیہ اس میں خرچ کیا جا رہا ہے۔ ہمارے پیٹ کی نامراد سڑکوں کی بھی مرمت
کرا دو۔ اور ہمارے ٹوٹے ہوئے دلوں پر بھی عمارتیں چنواؤ۔ ہم بھی پُرانے زمانہ
کی نشانیاں ہیں سب کو بھی زندہ آثار قدیم میں لوگ سمجھتے ہیں۔ ہم کو بھی سہارا دو۔
مٹنے سے بچاؤ۔ خدا تم کو سہارا دیگا اور بچائے گا۔

یہ کہتے کہتے دکھیا شہزادی چونکی۔ آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کو دونوں ہاتھوں
سے ملا۔ اور کہا میں بھی کیا دیوانی ہوں۔ تصویر سے باتیں کرتی ہوں کاغذی مہمت
کے آگے مرادیں مانتی ہوں سگرشاید کی خد کے بندے کے کانٹنگ یہ دیوانہ پن کی
باتیں پہنچ جائیں اور وہ انگریزی میں ترجمہ کر کے خداترس ہارڈنگ بیگم کو یہ مشادے
اور وہ اپنے خاوند لاٹ صاحب سے کہیں۔ کونسل کے ممبروں سے کہیں۔ بادشاہ مملکت
اور انکی ملکہ سے کہیں۔ کہ آل شاہجہاں کی حفاظت کے لئے بھی نئی دلی کی دیگر منظوریوں
کے ساتھ کوئی شاندار اور مصیبت شکن منظوری ہونی چاہئے۔ لے

دکھیا شہزادی کی کہانی

جس ننھی شہزادی کا یہ خیالی قصہ لکھا گیا ہے اُس کی ماں پر خدر کے زمانہ میں بڑی
بتا پڑی تھی۔ اس لئے وہ سچا اور اہلی قصہ بھی یہاں درج کیا جاتا ہے۔ وہ کہتی ہیں میں

لے لیڈی ہارڈنگ موم نے اس تحریر پر توجہ کر کے غریب شہزادوں کی مدد فرمادی تھی حسن نظامی

میری عمر سات برس کی تھی۔ اماں مجھ کو تین برس کا چھوڑ کر مر گئیں تھیں۔ ابا کے پاس ہی تھی۔ چودہ برس کا میرا ایک بھائی حبشید شاہ نامی تھا۔ مگر ماہ پانچ برس کی اٹھان سے میں برس کا معلوم ہوتا تھا۔ ابا جان نابینا ہو گئے تھے۔ اور ہمیشہ گھر میں بیٹھے رہتے تھے۔ ڈیوٹھی پر چار نوکر اور ایک داروغہ گھر میں تین باندیاں اور ایک مغلانی کام کرتی تھیں۔ حضرت بہادر شاہ ہمارے رشتے کے دادا ہوتے تھے اور ہمارا سب خرچ شاہی خزانہ سے ملتا تھا۔ ہمارے گھر میں ایک بکری پٹی ہوئی تھی۔ ایک دن مینے اس کے بچہ کو ستانا شروع کیا۔ بکری نے بگڑ کر میرے ٹکڑا مار دی۔ میں نے غصہ میں دست پناہ گرم کر کے بکری کے بچہ کی آنکھیں پھوڑ ڈالیں۔ وہ بچہ تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

کچھ دن کے بعد غدر پڑا۔ بادشاہ کے نکلنے کے بعد ہم بھی ابا کے ساتھ شہر سے نکلے بالکل میں سوار تھے اور حبشید بھائی گھوڑے پر ساتھ ساتھ تھے۔ دلی دروازہ سے نکلے ہی فوج والوں نے بالکل کو پٹلی۔ بھائی کو بھی گرفتار کرنا چاہا۔ انھوں نے تو ارجحائی ایک افسر کو زخمی کیا آخر زخمیوں سے چور ہو کر گرے۔ سامنے دو نوکر اور پتھر پڑے تھے۔ وہ آنکھوں میں گھٹپ گئے اور بھائی نے چنچیں مار مار کر تھوڑی دیر میں جان دیدی۔ بھائی کی بیقرار آواز سن کر ابا میاں بھی بالکل سے نیچے آئے اور ٹوٹل ٹوٹل کر لاش کے پاس گئے اور پتھر سے سر ٹکڑا کر لہو لہاں کر لیا۔ یہاں تک کہ ان کا وہیں خاتمہ ہو گیا۔

اس کے بعد فوج والوں نے ہمارا سب سامان لے لیا اور محکوم بھی بکڑ لیا جیسے وقت باپ اور بھائی کی لاش سے چمٹ کر خوب روئی اور انکو بے گور و کفن چھوڑ کر مجبوراً فوج کے ساتھ چلی گئی۔

ایک دیسی سپاہی نے افسر سے مجھے مانگ لیا اور اپنے گھر محکوم لے گیا جو پٹیلہ کی ریاست میں تھا۔

اس سپاہی کی بیوی بڑی بد مزاج تھی وہ مجھ سے برتن منجھواتی مصالحت پسوانی
جھاڑو دلواتی۔ اور رات کو پاؤں دلواتی۔

شروع شروع میں ایک رات دن بھر کی محنت سے تھک گئی تھی۔ پاؤں بانے
میں اونٹنگہ آئی تو اس جلا دنی نے دست پناہ گرم کر کے میری بھوں پر رکھ دیا جس سے
پلکیں نلک جھپس گئیں اور بھجوں کی چربی نکل آئی۔ میں نے ابا کو پکارنا شروع کیا کیونکہ
مجھے اتنی سمجھ نہ تھی کہ مرنے کے بعد پھر کوئی نہیں آیا کرتا جب ابا نے جواب نہیں دیا تو
میں اس عورت کے ڈر کے مارے ہم کر چپ ہو گئی۔ لیکن اس پر بھی اس کو ترس نہ آیا
اور بولی کہ پاؤں دبا۔ زخموں کی تکلیف میں مجھ کو میند نہ آتی تھی اور پیر بھی نہ دب سکتے
تھے۔ مگر قہر درویش برجان دریش۔ میں نے اسی حالت میں پاؤں دباے۔

سو پھر صالحت پینے میں مرچوں کا ہاتھ زخموں کو لگ گیا۔ اس وقت مجھ کو تاب نہ رہی اور
زمین پر پٹھلی کی طرح تڑپنے لگی۔ مگر بے رحم عورت کو تب بھی کچھ خیال نہ آیا۔ اور بولی چل نکلا
کام سے دم چرائی ہے۔ یہ کہہ لپی ہوئی مرچیں زخموں پر مل دیں اس وقت مجھ کو مارے
تکلیف کے غش آ گیا اور رات تک ہوش نہ آیا۔ صبح کو آنکھ کھلی تو بچار سپاہی میرے
زخموں کو صاف کر کے دوا لگا رہا تھا۔

تھوڑے دن کے بعد سپاہی کی یہ بیوی مر گئی۔ اور اس نے نئی شادی کی جو مجھ پر
بہت ہیر بان تھی۔ اسی کے گھر میں میں جوان ہوئی۔ اور اس نے میری شادی ایک خوب
آدمی سے کر دی۔ دو برس تک میرا خاوند زندہ رہا۔ اسکے بعد مر گیا۔ بیوہ ہو کر میں ولی
چلی آئی۔ کیونکہ وہ سپاہی بھی مر گیا تھا۔ اور اس کی بیوہ نے دوسری شادی کر لی تھی
دہلی میں آکر میں نے بھی اپنی قوم میں دوسری شادی کر لی جس سے فقط ایک لڑکی پیدا
ہوئی۔

اس خاوند کی پانچ سو بیوہ ہوا رانگریزی سرکار سے پنشن تھی۔ مگر تنخواہ قرضہ میں چلی گئی

اور اب ہم نہایت عسرت اور تنگدستی سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

بارہواں فسانہ بچاری شہزادی کا خاکی چھپر کھٹ

گل باتو خوار کے پندرہ برس کی ہوئیں جوانی کی راتوں نے گود میں لینا شروع کیا مرادوں کے دن پہلو میں گدگدیاں کرنے لگے۔ میرزا دارا بخت بہادر ولیعہد سابق بہادر شاہ کی تورچشم میں۔ باپ نے بڑے چاؤ چوچے سے پالا ہے اور جس دن سے وہ دنیا کو چھوڑ کر قبر میں گئے محل میں گل باتوں کی ناز برداریاں پہلے سے بھی دیدادہ ہوئے لگیں۔ اماں کہتی ہیں۔ نگوڑی کے نغصے سے دل کو بہت صدمہ پہنچا ہے باپ کا ہر کار نہ کرے اسکی ایسی دلداری کرو کہ اُن کی محبتوں کو بھول جائے۔

ادھر دادا یعنی بہادر شاہ بادشاہ کا یہ عالم ہے کہ پوتی کے لاڈ میں کسی بات سے دینے نہیں کرتے۔ نواب زینت محل ان کی لاڈلی اور منظور نظر بیوی ہیں۔ جو ان بخت انہی کو پیٹ کا شہزادہ ہے۔ اگرچہ میرزا دارا بخت کے قبل از دقت مر جانے سے ولیعہد کی کڑی منصب میرزا فخر کو ملا ہے۔ مگر جو ان بخت کی محبتوں کے سامنے ولیعہد کی بھی کچھ پریش نہیں ہے اور زینت محل باگریزی حکام سے اندر ہی اندر جو ان بخت کی تخت نشینی کے معاملات طے کر رہی ہیں۔ جو ان بخت کی اس دھوم سے شادی ہوتی ہے کہ مغلوں کی آخری تاریخ میں اس کو فر کی نظیر نہیں ملتی۔ غالب و ذوق ہنس لکھتے ہیں اور ان میں شہو شربازی کی جھلک ہو جاتی ہے جس کا ذکر شاعرانہ آواز دہلوی نے آب حیات میں کیا ہے اور غالب کو لکھنا پڑا ہے کہ مقطع میں آپڑی تھی سخن گسترانہ بات "ورد مجھے خدا نخواستہ استادشاہ یعنی جناب ذوق

سے کچھ عداوت نہیں ہے۔

یہ سب کچھ تھا۔ اور جواں بخت اور زینت محل کے آگے گہی کا چراغ نہ جلتا تھا مگر گل بانو کی بات سب سے زالی تھی۔ بہادر شاہ کو اس لڑکی سے جو تعلق تھا اور جسے سچی محبت اس تم لڑکی سے رکھتے تھے ایسی کیفیت زینت محل اور جواں بخت کو بھی میسر نہ تھی۔

پس اندازہ ہو سکتا ہے کہ گل بانو کس شان و شوکت و ناز و نعمت سے زندگی بسر کرتی ہو گی۔ ہونے کو میرزا دارا بخت کے اور بھی بال بچے تھے۔ مگر گل بانو اور اس کی والدہ سے ان کو عشق تھا۔ گل بانو کی ماں ایک ڈومنی تھی اور میرزا اس کو تمام بیگیا سے زیادہ چاہتے تھے۔ جب وہ مرے ہیں تو گل بانو بارہ سال کی تھی۔ میرزا درگاہ حضرت معلوم فیصلہ دین چراغ دہلی میں دفن ہوئے تھے جو دہلی سے چھ میل کے فاصلہ پر پڑانی دہلی کے کھنڈوں میں واقع ہے۔ گل بانو ہمینہ کے ہمینہ ماں کو لیکر باپ کی قبر دیکھنے جایا کرتی۔

تھیں جب جاہل قبر کو لپٹ کر ویتیں اور کہتیں۔ آباہم کو بھی اپنے پاس لٹا کر سلا لو۔ ہمارا جی تم بن گھبراتا ہے۔

جب گل بانو نے پندرہویں سال میں قدم رکھا۔ تو شباب نے بچپن کی خیر اور شہزادہاں میں تہن نصرت کر دیں مگر دلربائی کی شہزادیاں اس ستم کی ڈھائیوں کہ محل کا بچہ بچہ سپاہ مانگتا تھا سونے کے چھپر کھٹ میں دو شالہ تارنے سویا کرتی تھیں۔ شام کے چراغ جلے اور بانو چھپر پر پہنچیں۔ ماں کہتیں۔ چراغ میں تہی پڑی لاڈ و پلنگ چڑھی۔ تو وہ سسکا کر انگڑائی اور جھانی لیس کر مہر کے بکھرے ہوئے بالوں کو ماتھے سے میٹ کر کہتیں۔ اچھا بیو تم کو کیا سونے میں وقت کھوتے ہیں تمہارا کیا لیتے ہیں۔ تم ناحق کوٹوں پر لونی جاتی ہو۔ ماں کہتی تا بنو میں جلتی نہیں شوق سے آرام کرو خدا تم کو ہمیشہ شکہ بیند سلا تار کھے۔ میرے مطلب تو یہ ہے کہ زیادہ سونا آدمی کو بیمار کر دیتا ہے۔ تم شام کو سوتی ہو تو سیرے ذرا جلدی اٹھا کر مگر تمہارا تو یہ جلتی ہے کہ دل بچ جاتے ہیں۔ سارے گھر میں دھوپ پھیل جاتی ہے۔ لوٹیاں

ڈبر کے مارے بات تک نہیں کر سکتیں کہ بانو کی آنکھ کھل جائیگی۔ ایسا بھی کیا سونا آؤنی
کو کچھ گھر کا کام بھی دیکھنا چاہیے۔ اب ماشاء اللہ تم جو ان ہوئیں پراٹے گھر جانا ہے
اگر یہی عادت رہی تو وہاں کیونکر گزارا ہوگا۔

گل بانو ماں کی یہ تقریر سن کر بڑی ادھر کہتی۔ ہم کو ان باتوں کے سوا کچھ اور بھی کہنا
آتا ہے ہم سے نہ بولا کرو۔ ہمتیں ہم دو بھر ہو گئے ہیں تو صاف صاف کہہ دو۔ دادا حضرت
(بہادر شاہ) کے پاس جا رہی گے۔

محبت کا مکتب

اسی زمانہ کا ذکر ہے۔ میرزا داؤد شکوہ شہزادہ خضر سلطان کا بیٹا گل بانو کے پاس
آئے جانے لگا۔ قلعہ میں باہمی پردہ کا دستور نہ تھا۔ یعنی شاہی خاندان کے آپس میں پردہ
نہ کرتے تھے اس واسطے میرزا داؤد کی آمد و رفت بے دروک ٹوک ہوتی تھی۔

پہلے تو گل بانو ان کی بہن اور وہ ان کے بھائی تھے۔ چچا تایا کے دو بچے سبھے
جاتے تھے لیکن بعد میں عشق نے ایک اور رشتہ پیدا کیا۔ میرزا گل بانو کو کچھ اور سمجھتے تھے
اور گل بانو داؤد کو نگاہ ہری قرابت کے سوا کسی اور رشتہ کی نظر سے دیکھتی تھیں۔

ایک دن صبح کے وقت میرزا گل بانو کے پاس آئے تو دیکھا کہ بانو سیاہ دوشالہ
اُدھے سنہری چہر کھٹ میں سفید پھولوں کی سیج پر پاؤں پھیلائے بے خبر بیٹھی تھی
ہیں۔ منہ کھلا ہوا ہے۔ اپنے ہی بازو پر سر رکھا ہے۔ تکیہ الگ پڑا ہے۔ دونوں ہونڈیاں
کھینیاں اُڑ رہی ہیں۔

داؤد شکوہ چچی کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔ مگر کن انجیبوں سے گل بانو کا یہ عالم
منجھوری دیکھتا جاتا تھا۔ آخر نہ رہا گیا۔ اور بولا۔ کیوں چچی (حضرت) بانو اتنے دن چڑھے
تک سوئی رہتی ہیں۔ دھوپ قریب آگئی اتنا ان کو جگا دینا چاہئے۔ چچی نے کہا بیٹا بانو کو

مزاج کو جانتے ہو کس کی شامت آئی ہے جو انکو جگائے آفت برپا ہو جائیگی۔
 داور نے کہا دیکھئے میں جگاتا ہوں۔ دیکھوں کیا کرتی ہیں۔ چچی ہنسکر بولیں جگا دو
 تم سے کیا کہیں گی۔ تمہارا تو بہت سحاط کرتی ہیں۔ داور نے جاکر تلوے میں گدگدیاں
 کیں۔ بانو نے انکڑائی لیس کر پاؤں سمیٹ لیا۔ اور بے اختیار آنکھیں کھول کر نگاہ
 طیش سے پائنٹی کی طرف دیکھا۔ اس کو خیال تھا کہ کسی لونڈی کی شرارت ہے اسکو
 گستاخی کی مزاد دینی چاہئے، مگر جب اس نے ایسے شخص کو سامنے کھڑا دیکھا جس سے
 خود بخود اس کا دل محبت کرتا تھا تو شرم سے اس نے دو شالہ کا آنچل منہ پر ڈال لیا
 اور گھبر کر اٹھ بیٹھی۔ داور نے ہوش پاش منظر کو دل تھام کر دیکھا اور بے اختیار چپکے
 بولا۔ بوجھی حضرت میں نے بانو کو اٹھا بیٹھا یا۔

محبت نے بہت ترقی کی مکتب عشق کی ایجاد ختم ہو گئی اور دریں بحر و صیل کے ٹکڑے
 پڑے جانے لگے تو گل بانو کی ماں کو شبہ ہوا اور اس نے داور شکوہ کا اپنے گھر
 میں آنا بند کر دیا۔

غدر کے نو مہینے بعد

درگاہ حضرت چراغ دہلی کے ایک گوشہ میں ایک قبول صورت عورت بیٹھا ہوا
 کبیل اڈر سے رات کے وقت ہائے کر رہی تھی۔ سردی کامینہ دھواں دہاں بریں با
 تھا۔ تیز ہوا کے جھونکوں سے بوجھاڑ اس جگہ کو تر کر رہی تھی جہاں اس عورت کلبتر تھا
 یہ عورت سخت بیمار تھی۔ پسلی کے درد۔ بخار اور بے کسی میں اکیلی پڑی تڑپتی تھی بخار
 کی بیہوشی میں اس نے آواز دی گلبدن۔ اری او گلبدن۔ مرد امر گئی جلدی آ اور
 مجھ کو دو شالہ اڑھا دے۔ دیکھ بوجھاڑ اندر آئی ہے پردہ چھوڑ دے روشنک
 تو ہی آگلی۔ تو کہن غارت ہو گئی۔ میرے پاس کونوں کی انکیشی لاپلی پرتیل لے اسے

ورد سے میرا سانس رک جاتا ہے۔

جب کوئی اس آواز پر بھی اس کے پاس نہ آیا۔ تو اُس نے کبیل چہرہ سے ہٹایا اور چاروں طرف دیکھا۔ اندھیرے دالان میں خاک کے بچھونے پر تنہا بڑی مٹی چاروں طرف گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مینہ سنائے سے برس رہا تھا بجلی چمکتی تھی تو ایک سفید قبر کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ (جو اسکے باپ کی تھی)

یہ حالت دیکھ کر اس عورت نے ایک آہ کا نعرہ مارا اور کہلایا۔ بابا۔ میں تنہا ہی گل بانہوں۔ دیکھو اکیلی ہوں۔ اٹھو مجھے بخار چڑھ رہا ہے۔ آہ میری پسلی میں شدت کا دھڑک رہا ہے۔ مجھے سردی لگ رہی ہے۔ میرے پاس اس بوسیدہ کبیل کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ میری اماں مجھ سے کچھ گئیں۔ میں محلوں سے جلا وطن ہو گئی۔ بابا اپنی قبر میں جھک بلاؤ۔ اچھی مجھے ڈر لگتا ہے۔ اسن سے منہ نکالو اور مجھ کو دیکھو۔ میں نے پریوں سے کچھ نہیں کھایا۔ میرے بدن میں اس گیلی زمین کے کنکر چھبے ہیں۔ میں اینٹ پر سر رکھ لیٹی ہوں۔

میرا چہرہ کھٹ کیا ہوا۔ میرا دوشالہ کہاں گیا۔ میری سیج کدھر گئی۔ ابا۔ ابا۔ اٹھو کب تک سوؤ گے۔ ہائے درد۔ افوہ سانس کیو ٹکروں۔

یہ کہتے کہتے اس کو غفلت سی ہو گئی۔ اور اس نے دیکھا کہ میں مر گئی ہوں اور میرا والد میرا زوارا جنت مجھ کو قبر میں اتار رہے ہیں اور رورور کہتے ہیں

یہ اس پجاری کا خاکی چہرہ کھٹ گیا

آٹھ کھل گئی اور پجاری بانو ایوایاں رگڑنے لگی۔ سیرات کا وقت شروع ہو گیا اور وہ کہتی تھی۔ لوصاحب میں مرنی ہوں۔ کون میرے حلق میں شربت پکائیگا۔ کون مجھ کو لیسٹ سٹائیگا۔ کس کے دانو پر میرا سر رکھا جائیگا۔ آہی تیرے سو امیر کوئی نہیں

تو ایک ہے تیرا حبیب (صلعم) میرا منوس و رفیق ہے۔ اور یہ چراغ اولیاء میری پروسی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

شہزادی مر گئی۔ اور دوسرے دن گورغریباں میں گر گئی اور وہی اس کا ادبی
چھپر کھٹ تھا جس میں قیامت تک سوتی رہے گی۔

تیرہواں فسانہ غدر کی بنا غلط فہمیاں

خام کا بازار دہلی میں مشہور مقام تھا۔ جس کی آبادی قلعہ کے سامنے تھی اور
جس میں بڑے بڑے مشہور صنایع اور مختلف حرفتوں کے کاریگر رہتے تھے۔ غدر سے
کے بعد یہ محلہ جڑ بنیاد سے کھد گیا اور اب وہاں میدان کے سوا کچھ بھی باقی نہیں ہے۔
اپریل ۱۸۵۷ء کا ذکر ہے۔ ایک دن شام کے وقت محمد یوسف سادہ کار لالہ کی
پکیر کرے گیا تو اس کو ایک ہندو جو ہری کا ملازم ملا اور اس نے کہا کہ ہمارے لالہ
کو ایک مندر کا طلائی کلس بنوانا ہے۔ اور انھوں نے تم کو اپنے مکان پر بلوایا ہے
چلکر کام کا تخمینہ کر لو۔

محمد یوسف ایک مشہور چاندی والے دستکار کاراڑ کا تھا۔ خاص بازار اور خام
کے بازار میں جتنے چاندی والے رہتے تھے وہ لاہوریوں کے نام سے مشہور تھے اور
اب بھی ان کو لاہوری کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ چاندی کے برتن اور سونے کے زیور بناتے
تھے اور ہتھیار سازی کا پیشہ بھی اسی قوم کے ہاتھ میں تھا۔ محمد یوسف کے باپ نقری

برتن بناتے میں استاد مانے جاتے تھے۔ اور محمد یوسف کو ملع سازی کا کام کھایا تھا جو ہری کے نوکر نے طلائی کلس کا نام لیا تو یوسف اُسکے ساتھ چلنے کو آمادہ ہوا۔ مگر اس نے کہا کہ مغرب کی نماز پڑھ کر چلوں گا۔ وقت قریب گیا ہے۔ نوکر نے کہا اچھا میں بیٹھتا ہوں۔ تم نماز پڑھ لو۔ یوسف نے ایک مسجد میں جا کر نماز پڑھی اور باہر آکر نوکر کے ساتھ ہولیا۔ نوکر اس کو مالی داڑھ میں لے گیا۔ جہاں ہندو جو ہری آباد تھے۔ اور یوسف اکثر اس محلہ میں کام لینے دینے جایا کرتا تھا۔

ایک گلی میں جا کر نوکر نے کہا۔ تم ذرا یہاں بیٹھو میں ابھی آتا ہوں۔ یوسف کھڑا ہو گیا اتنے میں چار آدمی ایک گھر میں سے نکل کر آئے۔ یہ بہت لمبے ترنگے اور موٹے تانے جو ان تھے۔ ان چاروں کے ساتھ وہ نوکر بھی تھا۔ ان جو انوں نے یوسف سے کہا آؤ اس مکان میں چلے تاکہ ہم آپ کو کام دکھائیں۔ یوسف کو پہلے تو شک ہوا کہ یہ جو ہری نہیں ہیں خبر نہیں کیا بھید ہے۔ مگر پھر اس نے دل کو مضبوط کر کے خیال کیا کہ جو بھی ہو مجھے ڈرنا نہ چاہئے۔ اور وہ سیدہ ان کے مکان میں چلا گیا۔ وہاں ایک مولوی صاحب بیٹھے تھے جنہوں نے یوسف کو دیکھتے ہی سلام علیکم کی صدا بلند کی۔ یوسف کو اور بھی تعجب ہوا۔ اور وہ علیکم السلام کہہ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ مولوی صاحب نے کہا میاں صاحب زادہ تم کو ہم نے ایک جیلہ سے بلایا ہے۔ مندر کا کلس بنوانا مقصود نہیں ہے بلکہ کچھ اور کام ہے۔ میں اس شہر کا باشندہ نہیں ہوں اور یہ چاروں آدمی بھی پردیسی ہیں اور ہم سب ایک ہندو جو ہری کے ہماں ہیں جس نے ہم کو متہارا پتہ بتایا ہے۔ پتے مناسب ہے کہ تمہارے چچا ہتھیار سازی کا فن جانتے ہیں۔ اور دہلی کے میگزین میں ان کی آمد و رفت ہے اور وہاں کا سب حال ان کو معلوم ہے۔ پہلے ہمارا خیال تھا کہ انہی کو بلا لیں مگر معلوم ہوا کہ وہ بہت ڈرپوک آدمی ہیں۔ اس واسطے ہم نے تم کو بلانا مناسب سمجھا کیونکہ تم بڑے بہت والے ہو۔ جو ہری صاحب کے لڑکے سے آٹھ دن پہلے جو باتیں تم نے

کی تھیں۔ اُن سے معلوم ہوا کہ تمہارے دل میں اپنے دین کی محبت ہے اور بے دین ترگیوں کی حکومت سے تم خوش نہیں ہو۔ اس واسطے میں یہ قرآن شریف تمہارے سامنے رکھتا ہوں اس پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ کہ ہمارا بھید کسی سے نہ کہو گے۔ اور جو کام تم سے کہا جائے اُس کو پورا کر دو گے۔

یوسف نے کہا میں قسم کھانے سے ڈرتا ہوں۔ یہ بہت بڑی قسم ہے اس سے تو معاف کیجئے۔ البتہ اس کا عہد کرتا ہوں کہ آپ کا کام دینی ہو گا تو جان و مال سے اسکی مدد کروں گا۔ یہ جواب سن کر اُن چاروں آدمیوں نے تواریس سونت لیں اور کہا قسم نہ کھاؤ گے تو جان کی خیر نہیں۔ ہم ابھی ذبح کر ڈالیں گے۔ مولوی صاحب نے ان چاروں کو خنکی کے لہجہ میں اس حرکت سے روکا اور یوسف کو نرمی سے سمجھانے لگے۔

یوسف کچھ تو ڈرا اور کچھ اس پر مولوی صاحب کی باتوں کا اثر ہوا۔ اور فوراً قرآن شریف کو اٹھا کر سر پر رکھ لیا اور بولا۔ میں ہر دینی کام کے لئے جو آپ بتائیں حاضر ہوں۔ خواہ میری جان جانی رہے۔

مولوی صاحب نے یوسف کو سینہ سے لگا لیا اور فرمایا کہ ہمارا بس اتنا کام ہے کہ کم بصر میگیزین کے افسر تک پہنچو۔ اور اس کے پوشیدہ کاغذات حاصل کرو کیونکہ ہم کو معلوم ہوا ہے کہ انگریزوں نے ہندوستانی سپاہیوں کا مذہب خراب کرنے کی پھونک دی ہے۔ سو اور گائے کی چربی سے کار توں چکھنے کئے ہیں۔ تاکہ جب سپاہی ان کو نہایت سے کائیں تو ہندو مسلمان دونوں کا ایمان جاتا رہے۔

اگر یہ خبر سچ ہے تو افسر میگیزین کے پاس اس قسم کے کاغذ ضرور ہونگے ہم صرف ثبوت چاہتے ہیں۔ تاکہ ہمارا انتقام خدا کے نزدیک جائز ہو جائے۔ یہ چاروں آدمی ہندو ہیں۔ اور ایک فوج کے ملازم ہیں۔ اور مجھ کو ایک دوسری فوج کے مسلمان افسروں نے اس کام پر مقرر کیا ہے۔

یوسف نے کہا۔ ایک خانگی وجہ سے میں چچا کے گھر میں نہیں جاتا۔ پھر کیونکر میگزین تک میری رسائی ہو سکے گی۔

مولوی صاحب سکرا کر بولے۔ ہاں مجھے معلوم ہے کہ تمہاری منگنی تمہارے چچا کی لڑکی سے ہوئی ہے۔ اور اس وجہ سے تم ان کے گھر میں نہیں جاتے۔ مگر اس کام کے لئے گھر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم چچا سے میل جول کر کے۔ ان کے ساتھ میگزین جانا شروع کرو اور کسی طرح وہ کاغذ نکال لادو۔

یوسف نے کہا اگر ایسا کیا بھی جائے تو میگزین کے پوشیدہ کاغذوں تک رسائی پانا محال ہے۔ صاحب لوگ کاغذوں کو باہر توڑی ڈالے رکھتے ہیں۔

مولوی صاحب بولے۔ تم ابھی سے اگر مکر نہ کرو جاؤ تو سہی ضرامد ہو گیا اور ہم بھی تم کو ترکیبیں بتاتے رہیں گے۔

یوسف بہت اچھا کہہ کر گھر چلا آیا اور اپنے عہد کے انجام کار پر غور کرنے لگا۔

میگزین کا دربان

رحیم بخش نامی میگزین کا ایک دربان تھا اس کو انٹر میگزین کے خانگی کاروبار پر بھی بہت دخل تھا۔ یوسف جب اپنے چچا کے ساتھ میگزین میں آئے جانے لگا تو تیسرے دن رحیم بخش نے چٹکے سے اس کو الٹک بلایا۔ اور کہا تم جس فکر میں ہو اس میں میری مدد کی بہت ضرورت ہے۔ مولوی صاحب نے منہ سے بھی حلف لیا ہے۔ مگر میں خود کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ صاحب کو مجھ پر شبہ ہو گیا ہے۔ تم کو بتا سکتا ہوں کہ گو کہ ہر دالے کو ٹٹے کے برابر جو کرہ ہے۔ اس میں صاحب کے کہیں کسے ہیں اور کاغذات انہی میں رہتے ہیں پر یوں صاحب نے گو کہ ہر صاف کر لیا حکم دیا ہے۔ تمہارے چچا کا یہ کہہ کر ان کے تم بھی آنا اور رشتہ کے دروازہ کا قفل کسی طرح کھول کر کمرہ میں داخل ہو جانا۔

یوسف اس بات سے بہت خوش ہوا کیونکہ اس کو اپنے کھلت کی خدمت ادا کرنے کا شراغ مل گیا تھا۔ دوسرے دن وہ اپنے چچا کے ساتھ آیا اور چنگی گو کھر و کا رنگ صاف کرنے لگا۔ اسی حالت میں اس نے کمرہ کا دروازہ دیکھا جس میں ایک بھاری قفل پڑا ہوا تھا۔

دوپہر کو سب کاریگر کھانا کھانے اور ذرا آرام کرنے کے لئے میگزین سے باہر گئے مگر یوسف وہیں ٹھہرا رہا۔ پہرہ پر ایک ہندو سنتری موجود تھا۔ رجم بخش دربان موقع کی حالت دیکھی تو سنتری سے آکر کہا کہ تیرے گھر سے ابھی ایک آدمی آیا تھا اور کہتا تھا کہ تیری بیوی کو سٹے سے گر پڑی ہے تو جلدی وہاں جا۔ میں یہاں موجود ہوں۔ تیری عیسیٰ کے سپاہی کو ابھی بالوں بنگا۔ سنتری یہ سنکر فوراً چلا گیا۔ اور یوسف نے پھر پی کر کے آہنی اوزاروں سے جو گو کھر و صاف کرنے کے لئے وہاں رکھے تھے قفل کھول لیا۔ اور کمرہ میں جا کر کبس کھولنا چاہا۔ مگر وہ بھی قفل تھا۔ اس کو بہتیرہ کھولا۔ مگر وہ نہ کھلا۔ ناچار پھر قفل توڑ کر دیکھا تو کبس کے اندر کچھ بھی نہ تھا۔ یوسف نے جلدی سے دوسرا کبس توڑا اس میں چند کاغذات تھے۔ مگر وہ اتنے زیادہ تھے کہ اکیسٹ آدمی سے نہ چل سکتے تھے یوسف نے کچھ دیر سوچا کہ اب کیا کرے۔ آخر اس کے خیال میں یہ بات آئی کہ لغافوں کی شکل میں جعفر کاغذ ہیں ان کو نکال لینا چاہئے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور کاغذ کو رومال میں باندھ کر باہر آ گیا۔ اور پھر کمرہ کو مقل کر دیا۔

جب کاریگر کام پر آ گئے۔ تو یوسف میگزین سے نکل کر سیڈھا مالیوڑہ گیا۔ اور مولوی صاحب کو وہ سب کاغذات جا کر دیدئے۔ مولوی صاحب نے فوراً ایک محرر راڈنگا سے کو بلا یا جو انگریزی پڑھا ہوا تھا۔ اور اس سے ان کاغذات کو پڑھوایا۔ تو ان میں کارٹوں کے متعلق کوئی کاغذ نہ نکلا۔ ایک لغاف میں صرف اس مضمون کا ایک خط ملا۔ جو میرٹھ سے آیا تھا۔ کہ ”نئے کا تو سوں کے متعلق وہی کے سپاہیوں میں کیا چرچا ہے“

مولوی صاحب نے کہا بس معلوم ہو گیا۔ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ جب ہی تو دریا کیا گیا ہے۔ یوسف نے کہا۔ اس میں تو کوئی شبہ کی بات نہیں ہے۔ مولوی صاحب بولے میاں ابھی تم بچے ہو۔ فریب کی باتوں کو کیا جانو۔ یہ کہہ کر انھوں نے فوراً سفر کی تیاری شروع کی۔ اور یوسف کو شابشی دیتے ہوئے دہلی سے کہیں چلے گئے۔

غدر شروع ہو گیا

آخر اللہ منی کی تاریخ آگئی اور میرٹھ کی باغی فوج نے دہلی میں آکر غدر مچا دیا۔ انگریز قتل ہو رہے تھے۔ کوٹھیوں اور بیگلوں میں آگ لگ رہی تھی چاروں طرف غل غل اور لوٹ مار کا ہنگامہ گرم تھا۔ یوسف بھی اپنے گھر سے نکل کر قلعہ کے نیچے آیا۔ تو وہاں اس نے ایک سوار کو پہچانا۔ جو اپنی چار آدمیوں میں سے تھا جو مالی واڑہ میں ملے تھے سوار نے کہا۔ آؤ یوسف تم سے ایک کام ہے۔ ہم سب میگزین پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ چلو ہمارے ساتھ چلو۔ اور سیر کرو۔ یوسف نے کہا میں وہاں جا کر کیا کروں گا میں سپاہی نہیں ہوں نہ میرے پاس ہتھیار ہیں۔ مگر سوار نے مجبور کیا اور کہا وہاں انی نہ ہوگی۔ انگریز قبضہ ہو گئے یا بھاگ گئے اور ویسی فوج ساری ہمارے ساتھ۔ شریک ہو گئی۔

یوسف یہ سن کر سوار کے ساتھ کشمیری دروازہ تک گیا۔ جب میگزین پر پہنچے تو اس کا دروازہ بند تھا۔ اور باغی فوج اس کو گھیرے ہوئے کھڑی تھی۔ تھوڑی دیر میں دروازہ کی کھڑکی سے اسی رحیم بخش دربان نے جھانکا۔ اور کہا قلعہ سے زینے آؤ اور اوپر چڑھ کر اندر آؤ۔ یہاں صرف چند انگریز ہیں۔ یوسف نے رحیم بخش کے قریب جا کر پوچھا کہ کمرہ والی بات تو ابھی ظاہر نہیں ہوئی۔ رحیم بخش نے کہا کہ غافل فرماؤ میں کو ابھی کچھ بھی معلوم نہیں ہوا ہے۔

سپاہی زینے لینے چلے گئے اور یوسف اپنے گھر واپس آ گیا۔ تھوڑی دیر میں ایک فٹاک دھاکا ہوا جس شہر کے درو دیوار لرز گئے۔ ایسا معلوم ہوا جیسے زمین بھٹ گئی اور سب اس میں دھس گئے۔ یہ آواز میگزین اڑنے کی تھی۔ دہلی میں گولے اور گولیاں اس کثرت سے برسیں جیسے زور کی بارش اور اگلے پڑتے ہیں۔ ہزاروں آدمی ہلاک و زخمی ہو گئے اور کئی گھنٹے دھواں چھا یا رہا اور زخمیوں کی چیخیں بلند ہوتی رہیں۔

دہلی مستح ہو گئی

انگریزوں نے مصیبت کے چند مہینے کاٹ کر دوبارہ عروج حاصل کیا۔ پچاس کی سپاہ لیکر دہلی پر آئے اور خوں ریز معرکوں کے بعد دہلی کو دوبارہ مستح کر لیا۔ جس زمانہ میں دہلی پر گولہ باری ہو رہی تھی اور شہر کے سب باشندے بھاگ رہے تھے اس وقت یوسف کے چچا نے یوسف کے باپ سے کہا کہ انجامِ بُرا نظر آتا ہے بہتر یہ ہے کہ یوسف کا نکاح کر دیا جائے تاکہ جب ہم سب باہر نکلیں تو پردہ کی دقت نہ رہے یوسف کے باپ نے اس رائے کو پسند کیا اور یوسف کی شادی ہو گئی۔ مگر نکاح ہونے ہی کے بعد دہلی کی انگریزی فوج دہلی میں داخل ہو گئی اور بادشاہ قلعہ سے نکل کر مقبرہ بہایوں میں چلے گئے۔ یوسف کے والدین اور سب کہنے والے بھی رختوں میں بیٹھ کر بھاگے اور سیدھے قطب صاحب گئے۔ یوسف نے اس وقت تک دہلی کا چہرہ نہ دیکھا تھا۔ قطب صاحب میں جہاں ٹھہرے وہ جگہ بہت خراب تھی۔ اور اتنی کہ اس کنبہ کا گزارا دشوار تھا۔ دستور کے موافق اس پریشانی میں بھی دہلی کے شہر و حیا کا لحاظ رکھا آدمی رات کو یہ لوگ سو گئے تو انگریزی سواروں نے ان کو گھیر لیا۔ اور یوسف کو تلاش کرنے لگے۔ یہ سب لوگ بیدار ہوئے تو سواروں نے سب مردوں کو گرفتار کر لیا۔ اور نام معلوم کر کے۔ یوسف اس کے باپ اور اس کے چچا کو ساتھ لے گئے۔ اور باقی آدمیوں کو چھوڑ دیا۔ جو وقت یوسف رخصت ہوا

تو اس کی ماں بے قرار ہو گئی۔ اور اس نے رور و کر کہا کہ یہ میری بیس برس کی کمائی ہے یہ میرا کلوتا بیٹا ہے۔ اس کے بغیر میں زندہ نہیں رہوں گی۔ کل اس کی شادی ہوئی ہے اس نے تو ابھی اپنی دُلہن کو دیکھا بھی نہیں۔ تم اسے کہاں لئے جلاتے ہو اور کیوں لئے جاتے ہو۔

ایک سوار لے جواب دیا کہ یہ بڑا باغی مجرم ہے۔ اس کو پھانسی دی جائیگی تم اس سے آخری منال لو کہ اب یہ دوبارہ تمہارے پاس نہ آئے گا۔

یوسف کو یوسف کی ماں نے ایک چنچ ماری اور بیہوش ہو کر گر پڑی۔ یوسف کی بیوی ابھی تک گھونٹ نکالے غمرانی ہوئی بیٹھی تھی۔ مگر سوار کی بات سن کر اس نے گھونٹ اٹھا دیا اور دونوں ہاتھ ملتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ اس کے ہونٹ شرت غم سے لرز رہے تھے۔ اس نے منہ سے تو کچھ نہ کہا مرنِ حسرت کی نگاہ سے یوسف کو دیکھا اور کٹلی باندھ کر رابر دیکھتی رہی۔ یوسف مروتھا مگر وہ بھی یہ نظارہ دیکھ کر بے تاب ہو گیا اور مایوس نظروں سے اپنی دُلہن کی حالت دیکھنے لگا۔ وہ بھی چپ تھا۔ دُلہن چپ تھی۔ دُلہن کی آنکھوں کا سرمہ آنسوؤں کیساتھ بہ بہ کر سرخ و سفید رخساروں پر وہ جتے لگاتا تھا۔ اور یوسف کے چہرہ کو بھی یاس و ہراس نے زرد اور خشک کر دیا تھا۔

یوسف اور اسکے باپ و چچا کے ہاتھ رستی سے باندھ دئے گئے اور سوار انکو لیکر روانہ ہوئے لگے۔ تو یوسف کی دُلہن نے بہت دہی آواز سے کہا "جاؤ میں نے ہر معاف کیا"

پھانسی کا وقت

تحقیقات سے ثابت ہوا کہ یوسف اور اس کا چچا میگزین کی سازش کے مجرم ہیں

یوسف کا باپ بے قصور ہے۔ اس لئے اس کو رہائی دی گئی۔ اور باقی ان دونوں کو بھالسی کا حکم ہوا۔

جیل خانہ میں جہاں یہ سب قیدی بند تھے۔ یوسف نے ان مولوی صاحب کو بھی دیکھا جو مالی دائرہ میں ملے تھے۔ انہوں نے یوسف کو صبر کی نصیحت کی اور فرمایا ان چار سواروں میں سے ایک نے ہم سب کی مخبری کی ہے یوسف نے کہا آپ کہاں چلے گئے تھے۔ انہوں نے کہا میں میرٹھ جا کر پھر دہلی آ گیا تھا۔ مخبر نے تمام واقعات کی اطلاع افسر کو دے دی۔ رحیم بخش دربان تو میگزین کے ساتھ اڑ گیا اور میں یہیں گرفتار کر لیا گیا۔

یوسف کے چچا نے اپنی مصیبت اور اپنی لڑائی کا قصہ مولوی صاحب سے کہا تو وہ بولے بے شک یہ حالات رنج کے ہیں۔ مگر ہم نے دین کے خیال سے یہ سب کچھ کیا تھا۔ کیونکہ ہم کو یقین تھا کہ انگریز ہم کو کرسٹن بنانا چاہتے ہیں۔ اب معلوم ہوا کہ انگریزوں کی کچھ خطا نہ تھی۔ اور فساد پسند لوگوں نے جھوٹی افواہیں مشہور کی تھیں۔ لیکن چونکہ ہماری نیت نیک تھی۔ اور ہم نے محض اپنے مذہب کی محبت میں یہ کام کئے تھے۔ اس واسطے خدا ہم کو جزائے خیر دے گا۔ اور ہم ہشیدوں کی موت مرینگے۔ اور گناہ انکی گردن پر ہوگا۔ جنہوں نے جھوٹی خبریں مشہور کر کے یہ فساد کرایا۔

یوسف نے کہا۔ آپ تو کاغذ دیکھ کر فرماتے تھے کہ اس میں انگریزوں کا غیب ہے اب آپ ان کو بے گناہ کہتے ہیں۔ مولوی صاحب نے کہا اس وقت میرا یہ خیال تھا۔ مگر میرٹھ جا کر جب کاغذات اور حالات پر غور کیا گیا۔ تو میں نے فوجی افسروں سے کہہ دیا تھا کہ انگریزوں کی بددیہی کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ لیکن وہ نہ مانے اور فساد کر ہی دیا۔

صبح کو یہ سب لوگ پچانسی گھر کے سامنے لائے گئے۔ پہلے مولوی صاحب کو لٹکایا گیا اور انہوں نے آواز دیکر کہا کہ خبردار کوئی شخص بہت نہ ہمارے ہم سب غلط فہمی کا شکار رہیں۔ خدا ہم کو معاف کرے گا۔ اور ان کو سزا دی گئی۔ جنہوں نے انگریزوں کی عورتوں اور بچوں پر ظلم کئے۔ مولوی صاحب کے بعد یوسف اور اُس کے چچا کو بھی پچانسی ہو گئی۔

چودا ہواں فسانہ شہزادے کی جاوید کشتی

آج اور کل کے فرق کو سمجھنے میں یورپین اور ایشیائی فلاسفروں کے اقوال پر غور کرنے سے بہت آسانی ہو جاتی ہے۔ مگر اس کو مزید واضح سمجھ سکتا ہے آنکھ کو شاہد کا لطف نہیں آتا۔

نہر انگست ۱۹۱۲ء سے جرمنی قوم کا آج پیش نظر تھا اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کا کل کیا ہو گا۔ مگر ۱۹۱۴ء نے بنا دیا۔ دکھا دیا۔ اور سمجھا دیا کہ کل کی یہ حالت ہے اور ایسا دکھایا کہ اب فلسفہ کی ضرورت ہی نہ رہی۔

روس کا آج صدیوں سے مشہور تھا۔ ہندوستان کا بچہ بچہ اسکی آمد ہندوستان کا چرچہ بنتا تھا۔ اور ایک خوفناک وحشی اور موزی حریف کی چڑھائی کو آفت امن خیال کرتا تھا۔ لیکن آج ختم ہوا اور کل ایسا دیکھنے میں آیا کہ روس کا تاج و تخت ہی اٹھ رہا ہو گیا۔ دہلی میں مغلیہ خاندان کا غلغلہ اس کی تیغ زنی اور بزم آرائی کے دو گونا گوں صفات کے بسبب گھر گھر شور مچا ہوا تھا۔ اور ہندوستان کا کوئی خط انکی عظمت سے انکار کرے گی کی مجال نہ رکھتا تھا۔ مگر جب ان کا آج ختم ہوا تو کل کی حالت

کسی سے نہ دیکھی گئی۔

ایک دہلوی نے گریٹ مغل اعظم کی تباہی کے افسانے خود اپنی سے سن سُن کر لب بند کئے جن پر یہ افتاد پڑی تھی۔ تو ہندوستان نے لکھنے والے کے ان مضامین کو باسٹر پین کا خطاب دیا۔ اور اسکی انشا پردازی کو ان افسانوں کے باعث ہر دلفریبی حاصل ہو گئی۔ دہلوی محرر نے خیال کیا میری انشا کے کمال کو دیکھا جاتا ہے واقعات پر کسی کی نظر نہیں جاتی۔ اور کسی کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ ان سچے قصوں سے اپنی زندگی کے آج اور کل کو سمجھ اور نتائج نکال کر عبرت حاصل کرے۔

جو قوم پستی میں گرتی ہے وہ مقصود کے ذرائع کو مقصود بنا لیتی ہے۔ یہی حال ہندوستان کا ہے کہ اس نے تحریر کی داد دی۔ اسپرواہ واہ کی اور واقعات اہلی کی گہرائی پر کسی کی نظر نہ گئی اور گئی تو اسکی تائید کو ظاہر کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔

سال ۱۹۱۷ء میں اپنے پیارے عزیز ملامحمد واحدی ایڈیٹر اخبار خطیب و رسالہ نظام المشایخ کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ میز پر سر جھکائے کام کر رہے تھے۔ ان کا عمل بھی اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف تھا۔ اور میں ایک جاروب کش کو دیکھ رہا تھا جو بستہ پری سے صحن کو صاف کرتا تھا۔ اور جن کے پھولوں کو دیکھتا جاتا تھا۔ جب وہ کمرہ کا صحن صاف کر چکا تو نل سے پانی لیکر پھولوں میں ڈالنے لگا۔ پانی ڈالنے میں اس کا ہاتھ پھولوں کے ساتھ ایسی محبت کا اظہار کرتے تھے کہ اس کو میرے دل نے گل پرست خیال کرنا شروع کر دیا۔ جاروب کش نے ہر گلہ کا کوڑا صاف کیا۔ مرجھائے ہوئے پتے توڑ کر پھینک دیے۔ اور گملوں کو قرینے سے درست کرنے لگا۔ اتنے میں واحدی صاحب نے آواز دی۔ محمود! جاروب کش "حاضر ہوا جناب۔" لیکر ڈرائیو کا ہاتھ باندھ کر سالن آکھڑا ہوا۔ اور ایک تازہ خدمت کا حکم سن کر تعمیل کو باہر چلا گیا۔ اس کی پھرئی ثابت تھی اس کا قرینہ ادب مجھ کو بہت اچھا معلوم ہوا۔ اور میں نے خیال کیا کہ ایسا تیسرا

نور بہت کم دیکھنے میں آیا ہو گا۔ واحدی صاحب سے محمود جاربوب کش کا حال پوچھا
 گیا تو معلوم ہوا کہ وہ تیموری شہزادہ ہے۔ اور شہنشاہِ دہلی سے بہت قریبی واسطہ
 رکھتا ہے۔ محکو اس اطلاع نے جتنا لطم میں ڈالا۔ وہ روس کے اس باشندہ کی بیقراری
 سے زیادہ تھا جبکہ اس نے اپنے تاجدار کے قتل کی خبر سنی ہو گی۔ کیونکہ وہ ایک موت
 کی خبر تھی جو ختم ہو گئی اور یہ ایک زندگی کی اطلاع تھی جس کے ختم ہونے کی میں مد
 نہیں کر سکتا تھا۔ اس دن کے بعد میں جاربوب کش محمود کو اُس کے قدیمی لقب 'صاحب'
 سے یاد کرتا تھا کیونکہ مغلی تخت کی بحالی کے ایام میں سب شہزادوں کو صاحباً لم کہا جاتا تھا۔ یہاں تک
 کہ آخری ایام میں انگریز افسر بھی اُن سے اُنے متوسل شاہی کو صاحباً لم کے بلند خطاب تھا
 کرتے تھے۔ میرزا محمود ایک جوان آدمی ہے اب بھی دفتر اخبار خطیب کے قریب رہا مکان پر چھوٹے بچہ کا لباس
 ہے۔ جو شاید اب تک اپنے فخر کو بھولے نہیں ہونگے۔ کیونکہ سیٹ کی مجبوری سے جب
 اپنے باپ کو خدمتگاری کرتے دیکھتے ہیں تو شرماتے ہیں۔ فاتح قوم کے بچوں کو کام
 کرنے اور مشقت سے روزی پیدا کرنے میں کبھی عار کا خیال نہیں ہوتا۔ بشرطیکہ
 ان کو امید ہو کہ وہ اس تکلیف کے بعد پھر ایک عروج اور کامیابی کے زمانہ میں
 جلے والے ہیں۔ ورنہ زندگی ان کو دوزخ نظر آنے لگتی ہے۔ تیمور۔ بابر۔ ہمایوں
 نے اپنے پوتے میرزا محمود سے زیادہ زمانہ کی جفا اور دنیا کے خطروں کا تماشہ
 دیکھا تھا۔ مگر آخر میں سب ختم ہو گئے۔ میرزا محمود قیامت تک یہ توقع نہیں کر سکتا
 کہ اس کی گروش کے دن بھی کبھی پھرینگے۔ اور وہ ذلیل خدمتگاری سے نجات حاصل
 کر لیا۔ میرزا محمود کو شاید آج اور کل کے فرق سمجھنے کا کبھی خیال نہ آتا ہو گا۔ ورنہ
 وہ ایک ہی دن میں کامل ولی بن جاتا۔ اور خدمت لینے والے اسکے گھر پر ٹھہر جاتے
 ہوئے آتے۔ اسی دن جبکہ محکو میرزا محمود کی حالت کا علم ہوا۔ واحدی صاحب نے
 بیان کیا کہ ان کے چچا بہ خانہ میں ایک مزدور جو کل چلانے کا کام کرتا ہے حضرت مولانا

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا پوتا لانا نواسا ہے، دل میں سیاسی زخم کے برابر ایک مذہبی زخم بھی لگا۔ کیا خدا کی شان ہے کہ وہ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی جتنی شاگرد دی اور علمی خوش چینی کا آج تمام ہندوستان اتر کر رہا ہے ان کے پوتے یا نواسے کی یہ حالت ہو کہ وہ جا آئے کی مددوری کر کے پیٹ پالتا ہے۔ اس سے موجودہ ہندوستان کے بڑے آدمی آج اور کل کا نتیجہ نکال سکتے ہیں اور ان کو اپنے عروج و اقدار کی ناپائنداری کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اسپین کے قصر الحمرا اور اس کے بنے والوں کی بربادی تاریخوں میں پڑھ کر دل کی عبرت اٹھ اٹھ آسوروتی ہے۔ مگر لال قلعہ دہلی کے رہنے والوں اور ہندوستان پر خود مختار حکومت کرنے والوں کی تباہی پر کوئی ایک انسوی بھی نہیں بہاتا۔ محمود جاوید کش کا قدیمی مکان دفتر خطیب سے سو قدم کے فاصلہ پر لال قلعہ میں تھا۔ جواہرات جڑے ہوئے پاخانے غل خانے تھے۔ جہاں تاج و تخت کی دھوم تھی۔ جہاں لونڈی غلام کمرس باندھے ہوئے دوڑتے پھرتے تھے۔ یہ وہی شہزادہ محمود ہے جبکہ ابھی ایک چھاپہ خانہ میں چھاپو دیتا دیکھا گیا تھا جو حاضر جناب، کہہ کر اپنے آقا کے سامنے دوڑا ہوا آیا تھا۔ اور جو دست بستہ انتظار حکم میں خاموش کھڑا ہو گیا تھا۔ جس کے بڑے بڑے عظم ہندوستان کو بلا شکر کت غیر حکماں کہتے جن کے سامنے بڑے بڑے نواب راجہ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے تھے اور اپنے بادشاہ کے بلاوے پر حاضر حضور کہہ کر بے تحاشہ دوڑتے تھے۔ شہزادہ محمود کو یاد نہ ہو گا۔ تاریخ کو سب کچھ یاد ہے۔ شہزادہ محمود کے دل کو قدرت نے صبر دیدیا۔ مگر مورخ کیونکر صبر کر سکتے ہیں اور کس طرح اس عجیب انقلاب کو دل سے فراموش کر سکتے ہیں۔ شہزادہ محمود آج ایک ایسے مکان میں رہتا ہے جہاں اس کے بڑوں کا ایک کمین سے کمین غلام بھی رہنا پسند نہ کرتا۔ نہ پکی دیوار ہے نہ کچی چھت ہے۔ نہ پتھا محسن ہے۔ کچی مٹی کی دیواریں ہیں۔ جن میں کوئلہ اور ٹھیکر یوں کی بھجکائی ہے اور جن پر بارش کی بوندیوں نے خاک کے ذروں کو چیر کر گلکاریاں بنائی ہیں شہنشاہ

محمود کو آج وہ کھانا ملتا ہے جو اس کے بزرگوں کے خدمتگاروں نے بھی کبھی نہیں کھایا تھا۔ وہ سوکھی روٹیاں چٹنی سے کھا لیتا ہے۔ وہ اُبالی دال سے پیٹ بھر لیتا ہے۔ اور یہ بھی میسر نہ آئے تو اپنے معصوم بچوں کو تسلی دیتا ہوا فاقہ میں پڑ کر سو جاتا ہے۔ شہزادہ محمود کے پاس نہ کھواب کے کپڑے ہیں نہ زربفت کے۔ وہ اور اس کے بچے پیوند لگے کپڑے پہنتے ہیں۔ اور سردی آجائے تو بیٹھی ہوئی گدڑیوں اور بوسیدہ کسبوں کو اوڑھ کر رات بسر کرتے ہیں۔ آج جبکہ دسمبر ۱۹۱۷ء کا مہینہ ہے۔ دہلی میں نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ کے جلسے ہو رہے ہیں۔ اور بیرونی جہان گرم کمروں میں قیمتی تحائف اور قیمتی کپڑے پڑے سوتے ہیں۔ آج گورنمنٹ ہاؤس میں ہندوستان کے حکمران آگ کی انگلیٹھیوں کے آس کر سیوں پر لیٹے باتیں کر رہے ہیں۔ ٹھیک آج ہی کے دن شہزادہ محمود اور اسکی طرح سینکڑوں شہزادے ٹوٹے پھوٹے مکان میں لگی اور ٹھنڈی خاک پر بوسیا بچائے اور بچھی ہوئی رضائیاں اوڑھے بھوکے پیاسے پڑے ایڑیاں رگڑتے ہیں۔ اس کو کچھ بہت دن نہیں ہوئے۔ صرف ساٹھ برس کا زمانہ گزرا ہے کہ اسی دہلی میں لال قلعہ آباد تھا۔ اور اس میں شہزادہ محمود کے بزرگ شال ووشالے اوڑھے سوتے چاندی کی مہر پہنے میں پاؤں پھیلائے بے غل و غش پڑے سوتے تھے۔ اور ان کو یہ کیفیت خواب میں بھی نظر نہ آتی تھی۔ کہ ان کی اولاد ایک دن محتاجوں اور بیکیوں کی زندگی بسر کرے گی۔ اگر انکے خواب میں یہ حالت کبھی آجائی تو وہ ضرور ایک نوشتہ موجودہ دہلی کے عیش پرستوں کو لکھ جاتے کہ وقت کی گردش کو ہمیشہ یاد رکھنا۔ شہزادہ محمود کے بچے اگر اپنے بڑوں کا پہلا وقت یاد کر کے کہیں کہہ سکیں تو شال ووشالے منگوا دو سکو بھی۔ بہتری رو پہلی مہر یاں بنواد ہم بھی سونے چاندی کے برتنوں میں پلاؤ فورے کھائیں گے۔ ہم کو بھی ہندوستان کے راجہ نواب صاحب عالم پناہ کہہ کر اور جھک جھک کر سلام کریں۔ تو پکارا محمود سوائے اس کے کہ آنکھوں میں آنسو لے آئے اور آسمان کو دیکھ کر کلیجہ موس لے اڑ کیا خاک جو ان کی لکھا

دہلی والوں کو معلوم ہے کہ لال قلعہ کے شہزادے بڑے مہموم پرست تھے۔ سردی۔ گرمی اور خصوصاً برسات کے مہموموں سے خوب لطف اٹھاتے تھے۔ ہر مہموم کی ترکاریاں ہر مہموم کے کپڑے۔ ہر مہموم کے کھانے۔ دریا دلی سے غریبوں۔ محتاجوں کو بانٹنے اور کھلا کر کھانے کا اٹکا معمول تھا۔ مگر آج شہزادہ محمود کے بچے نہ سردی کی کوئی اچھی چیز کھا سکتے ہیں۔ نہ گرمی کی نہ برسات کی بہار ان کے گھر میں آتی ہے۔ نہ اندر کوئی خوشی۔ ان کو پیٹ بھر کر روٹی اور تین ڈبے کھنے کو کپڑا بھی پورا نصیب نہیں ہوتا۔ وہ بالکل بھول گئے کہ شہزاد ہیں۔ انکو بالکل یاد نہیں کہ ہم اس دہلی اور ہندوستان کے بادشاہ تھے۔ آج تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ایک خدمتگار باپ کے بچے ہیں۔ جو دس روپیہ جینے کا نوکر ہے جو صبح اندھیرے سے نوکری پہ جاتا ہے۔ اور رات کو اندھیرے میں واپس آتا ہے۔ ان بچوں کو اس کی خبر نہیں کہ انکے بڑے عید کے دربار کرتے تھے۔ اور لاکھوں روپیے اور شال دوشالے غریبوں کو تقسیم کرتے تھے۔ وہ تو یہ جانتے ہیں کہ کسی عید میں انکو نئی جوتی نصیب نہیں ہوتی۔ اور نہ کوئی نیا کپڑا ملتا ہے۔ کیونکہ ان کا باپ کہتا ہے کہ بیاباں کے جوتی اور کپڑا ہنگامہ ہے۔ میاں نے تنخواہ جو دی تھی وہ آٹے والے کے پاس چلی گئی اور پھر بھی اسکا قرضہ باقی رہ گیا۔ خدا دیگا تو ملو گچو کہ پر سے پرانی جوتیاں خرید کر لادینگے اور وہ نئی کہنے اور پرانی جوتیوں کے شوق میں انتظار کا زمانہ خوشی سے کاٹ دیتے ہیں جنگی بخار کے زمانہ میں جبکہ ان بچوں کا کماؤ باپ زمین پر بخار میں پڑا ہوا اٹے ہائے کرتا تھا ان بچوں نے اور معصوم بچوں نے کئی کئی وقت فاقوں میں گزار دیئے اور اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے دعائیں مانگیں کہ اللہ میاں ہمارے آبا جان کو اچھا کر دو۔ چھوٹے بچے نے اگر روٹی کی ضد کی تو بڑی بہن نے اسکو کلیجہ سے لگا لیا۔ اور کہا دیکھو آبا اچھے ہو جائیں تو آٹا لائینگے اناں روٹی پکائیں گی۔ ہم تم ملکر کھائیں گے۔ بچہ کہتا آبا کب اچھے ہونگے مجھے تو بہت کھو لگی ہے۔ تو بہن کہتی گھبراؤ نہیں۔ اب اچھے ہو جائینگے اور بازار جائیں گے۔ بچہ مصیبت کی دہی

شہزادی یعنی اپنی ماں کے پاس جاتا اور کہتا۔ اماں جان روٹی دو تو اسکو پیار کرتی اور کہتی۔ بیٹا روٹی کہاں سے لاؤں۔ خدا کمالے والے کو جان سے بچالے۔ ابھی تو اسی کے لالے بڑے ہوئے ہیں۔ میاں ہم غریب لوگ ہیں۔ نہ ہمارے پاس دو آپ نہ روٹی ہے نہ کپڑا ہے خدا خوش رکھے حکیم اجل خاں کو جنھوں نے دو الی کا اور کھانے کا بندوبست کیا۔ اور خدا خوش رکھے اس محلہ کے نیک آدمی محمد علی کا رخاندہ دار کو۔ تمہارے ابا کی اور سارے محلہ کے بیماریوں کی خبر گیری کر رہے ہیں۔ اُنھوں نے کھانے کو بھی پوچھا تھا۔ مگر میں غیرت کے مارے نہ کہہ سکی کہ میرے یہاں کھانا نہیں ہے۔ ہم تیموری نسل کے لوگ ہیں۔ کیونکر بھیک مانگیں اور خیرات کی روٹی طلب کریں۔ یہی بہت ہے کہ خیرات کی دو تمہارے ابا کے لئے لی۔ دیکھو بیٹا۔ تم ہندوستان کے بادشاہ کی اولاد ہو اور بادشاہ کی اولاد بھیک نہیں مانگا کرتی۔ اور نہ خیرات لیتی ہے۔ تم بڑے ہو کر کبھی بھیک نہ مانگنا۔ اور اپنے ابا کی طرح محنت مزدوری کر کے روٹی کمانا۔ بچے نے رو کر کہا اچھا اماں میں کسی سے نہیں مانگوں گا۔ مگر تم تو مجھے روٹی دو۔ اس وقت اس محتاج اور بے بس شہزادی نے آسمان کو دیکھا اور کہا اسے مالک تو ہی سب کا رزاق ہے۔ تو ہی سب کا عیب پوش ہے۔ یہ معصوم بچے بھوک میں بلبل رہے ہیں۔ میں کس سے اپنا دکھ کہوں۔ اور تیرے سوا اور کون سننے والا ہے۔ ہم پر رحم کر اور بیمار کو اچھا کر دے خدا کے فضل سے اب شہزادہ محمود تندرست ہو گیا اور کسی روز گاریں مصروف ہے جہاں اس کے مصارف کی ضرورتوں میں کمی نہیں پڑتی۔

مگر آج اور کل کے فرق سمجھنے کو اسکی اور اس کے اس خاندان کی حالت جو دہلی میں آباد ہے اور جس کی پریشانیوں اظہارِ آشیں ہیں بہت کافی ہیں۔ اور بغیر کسی فلسفیانہ بحث کے انسان عروج و زوال۔ ذلت و عزت۔ بے نیازی و محتاجی کا عینی تماشا دیکھ سکتا ہے اور نتیجہ نکالنے میں اس کو کچھ مشکل پیش نہیں آتی۔

اوجار و پیکش شہزادے! تو اور تیری موجودہ زندگی تیرے خاندان کا گذشتہ
عروج کا تصور کرنے کے بعد دنیا کے حکمرانوں اور دولت کے دیوانوں کیلئے ایک تادیب
عبرت ہو سکتی ہے اور فانی جاہ و منزلت کا غرور دماغ سے اس طرح نکلتا ہے جس طرح دھوپ سے
سیل اور ترشی سے نشہ اور یہی اس سرگزشت کے لکھنے کا مقصد ہے۔

پندرہواں فسانہ

عذر کی سیدانی ذکیہ سیلابانی

یہ بالوں کے جلنے کی بُوکھاں سے آئی ہے شاید پڑوس والے عامل صاحب
کسی کے لئے کوئی عمل کر رہے ہیں۔ جب سے ان کے پڑوس میں مکان لیا ہے یہی
آفت برپا رہتی ہے۔ کبھی گلی جلتا ہے۔ اور اس کی جگہ اس ہند سے دم گھٹنے لگتا ہے۔ کبھی
گوگل جلتا ہے اور گھر میں بیٹھنا دو بھر ہو جاتا ہے۔

ذکیہ کی والدہ نقیہ نے کہا۔ ہاں بیٹی یہ عامل سفلی کا عمل جانتے ہیں اور اس میں
اسی قسم کے خرافات ہوا کرتے ہیں۔ پرسوں سنا تھا۔ نواب زینت محل سلیم صاحبہ نے اپنے
کسی خاص ازار کو اس عامل کے پاس بھیجا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کبھی دشمن کے خلاف جادو
کرانے کی ضرورت پیش آئی ہوگی۔ یا اپنے شوہر حضرت سراج الدین محمد بہادر شاہ باوشاہ
دہلی کی محبت زیادہ کرنے اور اپنی طرف ہی متوجہ رہنے کے لئے کوئی عمل کر لیا ہو گا مگر سیلاب

خیال درست معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ بال جلنے کی بو آتی ہے۔ اور بال عداوت اور بغض کے عملیات میں جلا کرتے ہیں۔

ذکیہ بولی نہیں بی۔ میں نے باوا جان سے حساب ہے کہ محبت بڑھائے یا پیدا کرنے کے اعمال میں بھی مطلوب کے بال جلایا کرتے ہیں۔

نقیہ نے کہا جو کچھ بھی ہو۔ ہمارا تو اس پڑوس سے ناک میں دم ہے۔ تمہارے دادا نے خبر نہیں۔ ایسی جگہ مکان کیوں لیا ہے۔ جہاں رات دن اس قسم کے واہیات اور خلاف شریعت کام ہوتے ہیں۔ ذکیہ بولنے نہ پائی تھی کہ اس کے والد حضرت سید نور الہدیٰ تشریف لے آئے۔ سفید ڈاڑھی سفید عمامہ۔ سفید چوغہ۔ سفید رنگت۔ ستر برس کا سن۔ سال زہد و عبادت کے نور سے چہرہ پر ایک چمک اور جلال۔

ذکیہ نے اٹھ کر سلام کیا اور کہا۔ باوا جان آپ کو کئی دن ہو گئے چلتے وقت آپ نے فرمایا تھا کہ عرف ایک دن کے لئے جانا ہے۔ گڑ گاؤہ میں کسی صاحب سے ملا کر کل تک واپس آجائیں گے۔

سید نور الہدیٰ صاحب نے جواب دیا ہاں بیٹی۔ مگر کتنا پڑا۔ ان لوگوں نے دو دن تک نہ آنے دیا۔ کہو تم نے وہ چالیسوں حدیثیں یاد کر لیں۔ جو چلتے وقت میں نے تم کو پڑھائی تھیں۔

ذکیہ نے کہا۔ جی ہاں۔ میں نے انکو حفظ کر لیا۔ اور ترجمہ بھی یاد ہو گیا۔ مگر مجھ کو اس حدیث میں کچھ دریافت کرنا ہے دَعَّ مَائِدُیْنِیَّ اِلٰی مَا ذِیْہُنَّ د جھوڑا اسکو جو مجھکو شبہ میں ڈالے اور اختیار کر اسکو جو بے شبہ ہو، اس کا مطلب بھی طرح سمجھ میں نہیں آیا کہ جس چیز میں شبہ ہو اس کو کیونکر چھوڑ سکتے ہیں۔ ہر معمولی آدمی کی طاقت سے بڑھ کر ہے کہ وہ بے شبہ چیز اختیار کرے۔ کیونکہ آدمی کا دل ہر بات میں شبہ پیدا کرتا ہے۔ اور ایسی کوئی چیز نہیں معلوم ہوئی جو بالکل بے شبہ ثابت ہو جائے۔

سید نور الہدیٰ نے فرمایا۔ بیٹی یہ حدیث تین لاکھ حدیثوں سے چھاننی لگئی ہے اور اس میں ایک ایسا فلسفہ ہے جس کی ہر سلمان کو ضرورت پڑتی ہے۔ دینی کاموں میں بھی اور دنیا کی باتوں میں بھی۔ ایک اور حدیث الاعمال بالنیات (سب کام نیت پر منحصر ہیں) بھی اسی قسم کی ہے جو ہمارے سب کاموں میں مدد دیتی ہے کیونکہ ہر عمل کی اچھائی اور برائی نیت سے معلوم ہوتی ہے۔ ایک آدمی ظاہر میں چھ کام کرتا ہے مگر نیت بڑائی کی رکھتا ہے۔ وہ کام اچھا نہ کہا جائیگا۔ اور خدا تعالیٰ اس کے نامہ اعمال میں بدی لکھ دے گا۔ اور دیکھنے میں کوئی کام بُرا ہوا اور نیت نیکی کی ہو تو وہ کام نیکیوں میں شمار ہو گا تم نے سنا نہیں۔ ایک آدمی نے مسجد کے سامنے کھوٹی گاڑی تھی کہ نمازی مسافر اس سے اپنے گھوڑے باندھ کر نماز پڑھیں گے۔ مگر کسی نے اُس سے گھوڑا باندھا اور رات کے وقت بیوی آدمی اس کھوٹے سے ٹھوکریں کھا کر گرے اور انکے چوٹیں لگیں۔ مگر خدا نے کھوٹے گاؤں والے کے اعمال میں ثواب لکھا۔ کیونکہ اس کی نیت اچھی تھی۔

اور ایک آدمی نے کھوٹی اس لئے گاڑی بھی کہ لوگوں کے ٹھوکریں لگیں اور نماز پڑھ کر تکلیف ہو۔ اور وہ نماز سے باز رہیں۔ مگر کسی کے ٹھوکر نہ لگی۔ بلکہ اُنھوں نے اُس کھوٹی سے گھوڑے باندھے اور اطمینان سے مسجد میں جا کر نماز پڑھی۔ اس شخص کی چونکہ نیت خراب تھی۔ اس واسطے اسکے نامہ اعمال میں گناہ لکھے گئے۔

پس ہر بات نیت پر منحصر ہے۔ اور اس حدیث نے قیامت تک کے اچھے برے کاموں کا دو لفظوں میں فیصلہ کر دیا ہے۔ یہی حال اس حدیث کا ہے جس کو تم نے پوچھا کہ کیا بھی مسلمانوں کو دینی اور دنیا کے اعمال کا ایک قرینہ بتایا گیا ہے کہ شک و شبہ کے کاموں سے بچا اور شک و شبہ سے پاک کاموں کو اختیار کر دے۔

اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ کم علم اور کم عقل کے آدمی شک و شبہ اور بلا شک و شبہ باتوں کی آسانی سے تمیز نہیں کر سکتے۔ جیسا کہ تم نے سوال کیا ہے۔ مگر حدیث شریف

کافشار مسلمانوں کو شکل میں ڈالنے کا نہیں ہے۔ اس لئے تو اس حکیمانہ مقولہ شے لگوں کو آسان کر دیا ہے۔ الذین یُنسَو دین آسان ہے، تم لے پڑھا ہو گا۔ ہمارے دین اسلام میں کوئی بات دشواری اور مشکل کی نہیں ہے۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان لوگ دُکرا میں نہ ہیں بلکہ ایک صاف اور یقینی راستہ دین کے معاملات میں اختیار کریں۔ دُکرا کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی ایک کام کو کرتا ہے مگر اس کے دل میں دُکڑ پکڑ رہتی ہے کہ خبر نہیں یہ اچھا ہے یا بُرا۔ رسول خدا صلعم کا شمار یہ ہے کہ مسلمان دُکڑ پکڑ میں نہ رہے اور جس میں ذرا بھی دُکرا ہو وہ کام نہ کرے۔

میں تم کو مثال دیکر سمجھاؤں۔ ایک آدمی کہتا ہے۔ خدا ہے۔ دوسرا کہتا ہے نہیں ہے۔ تیسرا کہتا ہے خبر نہیں وہ ہے یا نہیں۔ مجھے اس میں کچھ شک ہے۔ اتنی باتیں تو آرام سے ہیں جو صاف اقرار کرتا ہے۔ اس کو بھی آرام ہے۔ جو صاف انکار کرتا ہے وہ بھی مطمئن ہے۔ شکل اس دُکڑ پکڑ والے کی ہے۔ جو کبھی خیال کرتا ہے خدا ہے اور کبھی سوچتا ہے نہیں ہے اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ دین کے معاملات میں جو بات قرآن اور رسول خدا صلعم کے خلاف اور عقل کے مخالف نظر آئے اور لوگ کہیں کہ یہ خلاف نہیں ہے اور اپنی دلیلوں کے زور سے تم کو شبہ میں ڈالیں تو تم شک میں نہ پڑو۔ اور قرآن و حدیث کے بلاشبہ طریقہ پر جمی رہو۔

یاد دنیا کے کسی کام میں تمہاری عقل اور تمہارے سچے دوستوں اور خیر خواہوں کا مشورہ کچھ اہم کہتا ہو۔ اور خلعت کچھ اور رائے دیتی ہو تو تم کو اپنی عقل اور دوستوں کے مشورہ پر عمل کرنا چاہئے کہ یہ بلاشبہ ہے اور خلعت کی رائے پر نہ چلو کہ اس میں شک و شبہ کا امکان ہے۔

ذکیہ نے کہا۔ یہی تو میرا سوال ہے کہ معمولی علم و عقل کا آدمی شک و غیر شک میں کیونکر فرق کر سکتا ہے۔

سید نور الہدیٰ نے جواب دیا۔ آگ کا کام جلا دینا ہے۔ اگر کوئی شخص کہے کہ آگ جلاتی نہیں۔ تو کون اس کو قبول کرے گا۔ اسی طرح خدا نے سب آدمیوں کو نفع نقصان کے سمجھنے کی عقل دی ہے۔

ایک آدمی کہتا ہے۔ میں مسلمان ہوں۔ رسول خدا صلعم کا کلمہ پڑھتا ہوں۔ مگر میری شان خدا نے ایسی بنائی ہے کہ اگر مجھ کو اپنا بزرگ تم نہ مانو گے تو خدا و رسول پر تمہارا ایمان لانا بیکار ہو گا۔ کیونکہ میری اطاعت تم پر فرض ہے۔

اس دعویٰ میں یہ شک ہے کہ اسلام کا مطلب تو خدا کی مکتائی اور رسول خدا کی رسالت کا قبول کرنا ہے۔ اگر کوئی آدمی اس کو قبول کر لے اور قرآن کو اپنا پیشوا بنالے تو پھر اس کو کیا ضرورت ہے کہ اپنے جیسے آدمی کو خدا و رسول کو برابر سمجھے اور اس کا زور و غلام بن جائے۔ کیونکہ خدا و رسول خدا اور قرآن اہل قرآن کی اطاعت کا کافی ہے ایسے آدمی کی اطاعت ضروری نہیں جو یہ کہے کہ مجھ کو نہ مانو گے تو خدا و رسول بھی تمہارا پیشوا ہو چکا ذکیہ لے کہہ۔ تو کیا ہم اپنے ہدایت کرنے والے اور خدا کا راستہ بتانے والے لوگوں کی اطاعت نہ کریں۔

سید نور الہدیٰ نے جواب دیا نہیں میرا مطلب یہ نہیں ہے۔ خدا نے قرآن شریف میں فرمایا ہے کہ اللہ کی اطاعت کرو۔ رسول کی اطاعت کرو۔ اور اصحاب مر کی اطاعت کرو اصحاب مر سے مراد یہی لوگ ہیں جو خدا و رسول کا راستہ سبکو بتاتے ہیں۔ میں مخالفت تو اس اطاعت کی کرتا ہوں جو یہ کہہ کر حاصل کی جائے کہ مجھ بندہ کی اطاعت کرو۔ ورنہ خدا و رسول خدا پر تمہارا ایمان لانا بیکار ہو گا۔ اور تم مومن نہ بن سکو گے۔ اس قول میں شک ہے ایسے اس کو کب کر دینا چاہیے۔ اور خدا و رسول اور قرآن و اہل بیت کی اطاعت بلاشبہ ہے۔ لہذا اس کو اختیار کر لینا چاہیے۔ ذکیہ بولی۔ تو اگر کوئی امام یا مذہبی پیشوا قرآن و حدیث پر عمل کر لے اور ہماری دنیاوی اصلاح کرنے کیلئے اطاعت کا طلب گار ہو تو وہ بھی بندے کی اطاعت ہو گی اور پند

کی اطاعت میں آپ نے شبہ فرمایا ہے۔

سید نور الہدیٰ نے جواب دیا۔ ہنسی ایسے امام یا پیشوا کی اطاعت میں رسولؐ اور خدا کی اطاعت ہے جو قرآن کے بموجب حکم دیتا ہو۔ اور جو امام یا پیشوا یہ کہے کہ تم قرآن نہ پڑھو تم حدیث نہ پڑھو۔ تم علم دین حاصل نہ کرو کیونکہ تم کو اسکی سمجھ نہیں ہے صرف میری اطاعت کرو اور محجوب کو قرآن۔ رسولؐ اور امام کا قائم مقام جانو تو ایسا شخص اطاعت کے قابل نہیں ہو کیونکہ قرآن شریف کی سب سے پہلی آیت میں علم حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور حدیث شریف میں رسولؐ خدا نے فرمایا ہے کہ علم حاصل کرنا عورت مرد پر فرض ہے۔ پس جو شخص دوسروں کو علم حاصل کرنے اور قرآن و حدیث پڑھنے سے روکتا ہے اور صرف اپنی اطاعت پر زور دیتا ہے وہ بالکل جھوٹے دینے کے قابل ہے۔ کیونکہ اس میں شک و شبہ ہے۔ اور شک و شبہ کے راستہ کو بروکھا لے کر ترک کر دینے کا حکم دیا ہے۔

ذکیہ نے کہا۔ اب میری سمجھ میں یہ بات آگئی۔ رسولؐ خدا نے اس حدیث میں ہمارے بہت بڑے فائدے کی بات فرمائی ہے۔ خدا ہرکو عمل کی توفیق دے۔

۱۰۵۱ء کا خواب

سید نور الہدیٰ نے دس مئی ۱۸۵۱ء کی صبح کو اپنی بیوی نعیہ اور لڑکی ذکیہ سے رات کا اپنا ایک خواب بیان کیا۔ اور کہا کہ میں نے ایک ہولناک آگ کے سماں سے برستی دیکھی ہے جس سے آدمی اور جانور جل جل کے مر رہے ہیں۔ میرے ذہن میں اسکی تعبیر یہ آئی ہے کہ ملک میں خوفناک فساد ہونے والا ہے۔

ذکیہ نے کہا۔ فساد کی تعبیر آپ نے کیوں کی قطع بیماری وغیرہ بلائیں بھی تو اس خواب سے مراد ہو سکتی ہیں۔

سید نور الہدیٰ نے فرمایا۔ مجھے جو کچھ معلوم ہے وہ تم نہیں جانتیں میں آپکی تیاری

سے پورے سو برس تک کے حالات جانتا ہوں۔ خدا تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ہکو برس
آئندہ تک کے واقعات بتا دیے ہیں۔ میں اپنی شہادت۔ تمہاری مصیبت اور اے
ذکیہ تیری دردناک پریشانیوں سے آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں مگر ان نہیں کر سکتا کہ مشیت کا
لکھا پورا ہو کر رہیگا۔

ذکیہ یہ سن کر خوف زدہ ہو گئی۔ لیکن چونکہ تعلیم یافتہ تھی مطمئن ہو کر بولی جب آپکو
سب کچھ دکھا دیا گیا ہے تو ہماری اور اپنی سلامتی کیلئے دعا کیوں نہیں کرتے۔

سید نور الہدیٰ نے فرمایا اس واسطے دعا نہیں کر سکتا کہ مجھ کو دکھا دیا اور بتلادیا گیا کہ اولیٰ
نوشہ ان مٹ ہے۔ اعمال کی سزا کا ملنا لازمی ہے۔ اس میں کسی کو دم مارنے کی جگہ نہیں ہے
اے ذکیہ میں امام شہم کی اولاد میں ہوں۔ میرا نسب آج تک بالکل درست اور صحیح ہے اور خدا تعالیٰ
سے میرے اعمال بھی برے نہیں ہیں میری شہادت اعمال ذاتی کی سزا نہیں بلکہ اجداد کی سنت ہے
تو اور تیری ماں کو بھی یہی خیال رکھنا چاہئے اپنے بزرگوں کی طرح مصیبتوں میں صبر سکون
کام لینا گھبرانے جانا کہ ہمارا خون ایک ہے امت رسول کی بہتری کے کام آیا والا ہے۔

نامفہوم الفاظ

یہ کہہ کر سید حب نے ایک جذبہ کی سی حالت میں یہ فرمانا شروع کیا۔

”ایک برس میں خون دوسرے برس میں تلج کی بربادی تیسرے سال ٹھوکریں
جو تھے سال زوال و بال۔ بھو چال، پھر جھولا۔ کوئی نیچے آئیگا۔ کوئی اوپر
جائیگا۔ اسے بعد ساٹھ برس گزر گئے۔ تو خون۔ بے امنی۔ دریا زمین کو نکل گیا۔ زمین
سو بج کر کھا گئی۔ بوا اور تانبا بولنے لگا۔ اور بائیں گونگی ہو گئیں۔ دو مہینہ کا غرور
تخت پر اور دھخت چمپر کے اندر مٹی کے چراغ میں لال بدخشاں کی روشنی۔ ذکیہ کے بچے
تانبا دکی سرکشی۔ مسلمان پہاڑ پر اور سب زمین پر۔“

سید صاحب یہ فرماتے فرماتے چپ ہو گئے۔ اور رونے لگے۔ ذکیہ اور نقیہ دونوں
پرائی بی بیٹ چھائی کہ منہ سے کچھ نہ بول سکیں ورنہ چپ چپ یہ مجذوبانہ باتیں سنتی ہیں
یہاں تک کہ سید صاحب اٹھ کر باہر چلے گئے۔

عذر

آخر کے حصہ کا مشہور قدر شروع ہو گیا۔ میرٹھ کی فوج باغی ہو کر دہلی میں آئی اور
وہ آفت چھائی کہ سب معاملات زیر و زبر ہو گئے۔ ذکیہ اور اس کے والد نہو خواں
کی مسجد کے پاس ایک مکان میں جو دہلی کے معمولی مکانوں کا نمونہ تھا رہتے تھے عذر
شروع ہوا تو سید نور الہدیٰ نے گھر سے نکلنا ترک کر دیا۔ یہاں تک کہ انگریزوں نے
دہلی پر تسلط حاصل کر لیا۔ باغی بھاگ گئے یہاں در شاہ قلعہ چھوڑ کر فرار ہوئے
اور گر قتل کئے گئے۔

شہر کی لوٹ اور گرفتاریوں کے زمانہ میں بھی سید صاحب گھر سے نہ نکلے آخر
ایک فوجی جمعیت ان کے گھر میں گئی اور سید صاحب کو گرفتار کر لیا۔ اسباب لٹ گیا
فوج کا افسر انگریز تھا۔ اس نے کہا کیا تم سچ نور الہدیٰ ہو۔ اور تم ہی نے افواج کے
فلاں فلاں سردار کو خطوط لکھے تھے۔ کہ انگریزوں کا قتل عام لوح محفوظ پر ہیں نے
لکھا دیکھا ہے۔

سید صاحب نے کہا ہاں میں وہی نور الہدیٰ ہوں۔ افسر نے تعجب کے لہجہ
میں کہا تم اپنے جرم کا اقرار کرتے ہو۔ سید صاحب نے کہا اپنی تحریر کا جھکو اقرار ہے
جرم کا اقرار نہیں ہے۔ انگریز بولا۔ کیا تم اس کو جرم نہیں سمجھتے کہ جاہلوں کو ایک گھٹی
بات لکھ کر قتل عام پر راغب کیا۔ سید صاحب نے اس کا جواب کچھ نہ دیا۔ اوساں کو
دیکھ کر ہنسنے لگے۔ ان کو ہنسا دیکھ کر۔ انگریز افسر کو غصہ آیا۔ اور اس نے ایک نیگین

ان کے ہونٹوں پر ماری جس سے ان کا جبر اکٹ گیا۔ اور خون ڈار مٹی پر پہنے لگا ذکیہ یہ دیکھ کر چیخی۔ ہائے میرے ابویا۔ سید صاحب نے زخم کھا کر بھی گھبراہٹ ظاہر نہ کی اور پھر آسمان کو دیکھا۔ اور خون اپنے چہرہ اور سینہ پر ملنے لگے یہ دیکھ کر افسر نے اشارہ کیا اور ایک سپاہی نے توار کا ایک ایسا ہاتھ مارا کہ تیر صاحب و شکر مے ہو کر گر پڑے۔

اس کے بعد فوج باہر چلی گئی۔ اور عورتوں سے کچھ تعرض نہ کیا۔ ذکیہ اور نقیہ نے یہ عالم دیکھ کر پہلے تو بہت نوحہ و بکا کیا اس کے بعد غمید کی میت دفن کرانے کا سہارا کرنے لگیں۔ مگر دہلی میں اس وقت کوئی نہ تھا جو ان کی مدد کو آتا۔ آخر انہوں نے خود ہی لاش کو اپنی خون بھرے کپڑوں میں مکان کے صحن کو کھود کر دفن کر دیا۔

گھر کا سب مان لٹ گیا تھا لیکن آٹا وال لکڑیاں موجود تھیں۔ انہوں نے چند روز ان سے بسر و قات کی اور جب یہ ختم ہو گئیں تو کھانیکا فیکر ہوا۔

اس وقت شہر میں امی جی (اس کا اعلان ہو چکا تھا اور بھاگے ہوئے آدمی اگر آتا ہو رہے تھے۔ ذکیہ نے اپنی والدہ سے صلاح لیکر حاکم دہلی کے نام ایک خط لکھنے کی ٹھہرائی۔ تاکہ اس سے کچھ امداد حاصل ہو۔ نقیہ نے کہا خط تو لکھ لو گی۔ مگر اس کو پہچانے گا۔ کون۔ ذکیہ نے کہا پڑوس میں جو عامل صاحب رہتے ہیں۔ مناسب ہے وہ غدر میں نہیں بھاگے۔ اور سرکار کے بڑے خیر خواہ ہیں۔ تم ان کے پاس جا کر یہ خط کسی طرح پہنچا دو۔ نقیہ نے اس تجویز کو پسند کیا اور خط لیکر عامل کے پاس گئی عامل ایک نوجوان آدمی تھا۔ اور گھر کی حالت سے معلوم ہوتا تھا کہ عامل بہت خوش حال ہے۔

نقیہ نے برقع کے اندر سے عامل کو اپنی کیفیت سنائی۔ عامل نے بہت ہمدردی ظاہر کر کے کہا حاکم دہلی سے مدد کی امید نہ رکھو۔ سید صاحب کا نام بڑے باغیوں میں فوج ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ انہوں نے فوج کو بھر کالے میں بہت ریا دہیہ لکھا

اگر تم قبول کرو تو میں خود کچھ حاضر کر دیا کرونگا۔ نقیہ نے کہا ہم خیرات کسی سے نہیں لے سکتے مہتار کچھ کام ہو تو اس کے عوض جو دو گے لے لیں گے۔ عامل نے کہا۔ ہاں اپنی لڑکی سے کہو کہ وہ میری کتابوں کی ایک فہرست بنا دے۔ اور پرانگندہ اور اق کو ایک جگہ کر دے۔ اس کے عوض میں تم کو دونوں وقت پکا پکا کھانا اور اوپر کا سب خرچ دیا کرونگا۔

نقیہ نے گھر آ کر ذکیہ سے یہ حال کہا۔ اور اس نے اس نوکری کو قبول کر لیا عامل نے ایک کمرہ بتا دیا جہاں کتابیں تھیں اور ذکیہ و نقیہ صبح سے شام تک وہاں کام کرنے لگیں۔

ردی میں ایک خط

ذکیہ کاغذوں کو درست کر رہی تھی کہ اس کو ایک خط ردی کاغذوں میں ملا ہوا دستیاب ہوا جس کا مضمون یہ تھا۔

مے عامل صاحب تعویذ پہنچ گیا۔ ہم ہدایت کے موافق کام کرنے کو تیار ہیں۔ دعویٰ پنجاب سے آگئی ہے۔ سید نور الہدیٰ صاحب بزرگ کے بارے میں جو کچھ آپ نے لکھا ہے معلوم ہوا۔ ہم عنقریب ان کی زیارت کو آئینگے۔ اور ان کی کرامات کے موافق ان کو نذر دیں گے۔ بھکو اوپری تکلیف بہت ہے کیا آپ اس کے اتار کی کوئی ترکیب بتا سکتے ہیں۔ پہلے آپ نے کشمیر کے عامل کا پتہ بتایا تھا۔ اب ہم سب کی صلاح کشمیر کی ہو گئی ہے راقم آپ کا معتقد (ن۔ ن)

ذکیہ اس خط کو پڑھ کر حیران رہ گئی اور اس نے بہت عجز کے بعد سمجھا کہ یہ خط جنرل نخلین کا ہے جو حملہ دہلی کے وقت پہاڑی پر تھا۔ تعویذ سے مراد فیضہ اطلاع ہے جو عامل نے

بھیجی ہوگی۔ پنجاب کی دہونی سے مطلب فوج و توپخانہ ہے۔ جو تعویذ کی رعایت سے ایک اصطلاح بنائی گئی ہے۔ ادبیری تکلیف کا مطلب پہاڑی کے مورچوں کی تکلیف ہے اور آثار کا مقصد یہ ہے کہ دہلی میں داخل ہونے کی ترکیب بتائے۔ کشمیر کے عامل سے مراد کشمیری دروازہ ہے جہاں سے فتح دہلی کے وقت حملہ ہوا۔ اور سید نور الدین کی نذران کا قتل ہے۔ ذکیہ سمجھ گئی۔ کہ ن. ن. سے مراد جنرل نکلسن ہے۔ اور میرے باپ کی مخبری اسی عامل نے کی تھی۔ یہ خیال کر کے ذکیہ کی آنکھوں میں زمین و آسمان تاریک ہو گئے اور اس نے عامل سے اپنے باپ کا بدلہ لینے کی دل میں ٹھان لی۔

چنانچہ دوسرے دن رات کو وہ پھری لیکر عامل کے مکان میں گئی۔ تاکہ سوتے ہیں اس کا کام تمام کر دے۔ مگر اس نے جاکر دیکھا کہ عامل خواب گاہ میں نہیں ہے تو وہ مایوس ہو کر گھر واپس آ گئی۔ یہاں آ کر اس نے دیکھا کہ اس کی ماں کی لاش خون میں غلٹاں پڑی ہے اور سر ہانے ایک خطر کھا ہے جس پر گھبراہٹ ہوئی۔

”ذکیہ تیرے ارادے کا بدلہ۔ اور اپنے رقیب کا انجام۔ تیری ماں رڈا لگئی کہ دم جھکو تجھ تک پہنچنے میں سہرا دیتی۔ آج تو نے میرے مارنے کا ارادہ کیا تو میں نے اس کو قتل کر دیا۔ اب خط پڑھ چک کہ تو دہلی سے باہر جانے والی ہے۔“

آخری فقرہ کو پڑھ کر ذکیہ ماں کا صدمہ بھول گئی۔ اور چاہتی تھی کہ غل مچائے اور محلہ والوں کو مدد کے لئے پکارے کہ کسی نے دوڑ کر اس کا منہ بند کر لیا۔

انبالہ

ذکیہ کا منہ بند کیا گیا۔ آنکھیں بند کی گئیں یہاں تک کہ تھوڑی دیر میں اس کے جوش بھی بند ہو گئے اور اس کو اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ اور ہوش آیا تو دیکھا کہ وہ ایک

اجنبی مکان میں ہے۔ اور عامل سامنے بیٹھا ہے۔ اور کہتا ہے تم انبالہ میں ہو۔ میں انگریزوں کی پناہ میں آگیا ہوں۔ اب تم کو باپ کا بدلہ لینے کی حوس نہیں ہے۔ ذکیہ نے کہا میں سید ہوں شرم کرو اور نامحرم ہو کر سامنے نہ آؤ۔ عامل نے کہا۔ ابھی نکاح ہو جائیگا اور محرم بن جاؤں گا۔ ذکیہ نے اپنے منہ کو ہاتھوں سے چھپا لیا اور اپنے انجام و بے بسی پر غور کرنے لگی۔

خون

ذکیہ نے چہرہ پر ہاتھ رکھا ہی تھا۔ کہ یکایک اسکو ایک زبردست آہٹ کی آواز آئی۔ اور کبھی نے نکالی دیکر عامل کے سر پر کچھ مارا ذکیہ نے منہ کھول دیا اور دیکھا عامل کے نوکر نے لٹمہ مار کر عامل کو قتل کر دیا ہے۔ اور ذکیہ سے کہتا ہے جلدی بھاگو۔ میں تمکو بچانے آیا ہوں۔ ذکیہ اس کے ساتھ اٹھ کر بھاگی۔ باہر ایک رختہ کھڑا تھا۔ اس میں تار ہو کر قاتل نوکر کے ساتھ چلی گئی۔

کرنال

نوکر ذکیہ کو لیکر کرنال آیا جہاں اسکا گھر تھا۔ اور ذکیہ کو اپنی ماں کے پاس ملتا رہا۔ اور بولا بی بی تم سیدانی ہو۔ اس ظالم عامل کی نوکری میں نے یہ سنا اور اس کے بڑے ارادے کو معلوم کر کے مار ڈالتا ثواب جانا۔ اب دعا کرو کہ گرفتار ہوں۔ یہ باتیں کر رہی رہا تھا کہ باہر پولیس نے اس کو آواز دی۔ نوکر نے کہا تو قضا آگئی اماں خدا حافظ۔ اس عورت کی خبر رکھنا میں بھاگتا ہوں۔ جی بچا تو کبھی آجاؤ نکلا ورنہ یہ اتھری سلام ہے۔ یہ کہہ کر دوسرے دروازہ سے نکل کر باہر چلا گیا۔ پولیس تین آوازیں دیکر اندر داخل ہو گئی۔ اور جب اس نے دوسرے دروازہ کا حال معلوم کیا تو قدموں کے نشاں

باہر چلی گئی۔ مگر ہر چند تلاش کیا قاتل نوکر کا سراغ پولیس کو نہ چلا۔
آخر سرکار نے نوکر کے گھر کی قبضی کا حکم صادر کیا اور سارا سامان نیلام ہو گیا مگر
کی مال گھر سے ٹھکرا اپنے کسی رشتہ دار کے یہاں چلی گئی۔ اور ذکیہ کو ساتھ لیتی گئی۔ مگر
اس رشتہ دار نے ان کو اپنے ہاں ٹھہرانے سے انکار کیا۔ اور کہا تم سرکاری مجرم سے
تعلق رکھتی ہو۔ میں اپنے ہاں تم کو نہیں ٹھہرا سکتا۔ نوکر کی ماں نے اپنے سب رشتہ داروں
اور بیٹے کے دوستوں کے گھر دیکھ لئے۔ مگر کسی نے ان کو پناہ نہ دی۔ تو مجبور ہو کر
بڑھیا نے ذکیہ سے کہا۔ اب چلو مسجد چلو کہ وہ خدا کا گھر ہے۔ وہاں تو امن ملے گا۔ مگر جب
یہ مسجد میں گئی تو ملانے کہا یہاں عورتوں کے لئے جگہ نہیں ہے۔ ذکیہ نے کہا۔
”ہم سبکیں ہیں ہم مظلوم ہیں۔ ہم بے وارث ہیں۔ ہمارے
سب سہارے ٹوٹ گئے اس واسطے خدا کے دروازہ پر پہنچا
ڈھونڈ رہے آئے ہیں۔ سبکو نہ نکال کہ ہمارا اب کہیں ٹھکانا نہیں
ہے ہم کہاں جائیں کہ کوئی ہمارے گھر میں نہیں آنے دیتا
خدا سے ڈرا اور لاوارثوں کو دہکے نہ دے“

ملانے ہنس کر کہا۔ یہ نماز پڑھنے کی جگہ ہے۔ سرے نہیں ہے جس میں تم ٹھہرو۔ خیر انکی
ہے کہ خود نکل جاؤ ورنہ چٹیا پکڑ کر نکال دینگا۔ بڑھیا نے رو کر کہا۔ یہ سیدانی ہے اسکی
بے حرمتی نہ کر۔ اور ایسے الفاظ منہ سے نہ نکال۔ ملانے کہا ایسی بہت سی سیدانیاں بھی
ہیں۔ باتیں نہ بناؤ۔ اور یہاں سے جاؤ۔ یہ کہہ کر ملانے دونوں کو دھکے دیدیے جس کے
صدمہ سے پجاری بڑھیا مسجد کے دروازہ کے باہر اوندھے منہ گر پڑی اسکے رہو ہے
دو دانت بھی ٹوٹ گئے اور ہتھوڑی دیر کے لئے وہ بیہوش ہو گئی۔ ذکیہ نے بڑھیا
کو سہارا دیکر اٹھایا۔ اپنے ڈوپٹے سے اس کے منہ کا خون پونچھا۔ اور کہا اماں بوسھیا
ہو گھبراؤ نہیں خدا ہماری مدد کرے گا۔ بڑھیا نے بڑی ناتوان اور دہیمی آواز میں پ

دیا۔ ہاں بیٹی۔ خدا ہی مددگار ہے میرے سینہ پر بہت چو شلگی ہے۔ میرا سانس کا جاتا ہے میں بیمار تو مدت سے تھی اسپر ہیٹھ کی جڈائی۔ گھر کی تباہی۔ اور اس در بدر کی بڑائی کا صدمہ ملانے اس زور سے دھکا دیا تو ادھیں ایسی گری ہوں کہ اب زندگی کی امید نہیں معلوم ہوتی ہے۔ میرے دل پر چوٹ لگی۔ یہ کہتے کہتے بڑھیا کو ابکائی آئی۔ اور اسے خون کی لہے کی جس سے معلوم ہوا کہ اس کے پیٹ پر زبرد ضرب آئی ہے۔ خون کی تہ کرتے ہی بڑھیا کا ہوش گم ہوئے لگا۔ اور ذکیہ بھی گھبرا گئی۔

بڑھیا نے کہا:- اے ملا تو نے میری جان ناحق لی۔ میں اس بے وفائی کی کو لیکر کوئی سمجھی۔ میں مرنے ہوں اپنے رسول کے پاس جاؤنگی بی بی فاطمہ کے قدموں میں سر جھکاؤں گی اور کہوں گی کہ تمہاری ایک بیٹی پر جو ان بیٹے کو قربانی چڑھایا۔ اور خود بھی فدا ہو گئی۔ بی بی فاطمہ مجھ کو گلے لگالیں گی۔ رسول خدا حضرت علی کے ہاتھ سے کوثر کا جام منجھو دلو اسے۔ آہ دم چلا۔

اور پھر ابکائی آئی بڑھیا نے پھرتے کی اور جیتا جیتا لالہ خون سہیں آیا۔ اس نے بڑھیا کا کام تمام کر دیا۔ اور ایک ہی چمکی لیکر اس نے جان دیدی۔

اس وقت عجیب منظر تھا۔ ذکیہ لاش کو سنبھالے مسجد کے دروازہ کے آگے گشاج عام پر بیٹھی تھی۔ اور کسی پرسان حال کو آنکھوں ہی آنکھوں میں ڈھونڈتی تھی۔ مگر اس وقت کوئی راہ گیر بھی نہ آیا تھا۔ جو ان بیکسوں کی بات پوچھتا۔ ملانے مسجد کا دروازہ بند کر لیا تھا۔ آخر ذکیہ نے مایوس ہو کر آسمان کو دیکھا اور کہا۔ اے خدا میں تیرے پیارے رسول کا خون ہوں۔ میری مٹی۔ اور مجھ کو اس امتحان میں نہ ڈال۔

یہ ایک ایک فقیر ادھر سے گذرا۔ اور اس نے جو یہ حالت دیکھی تو محلہ والوں کے پاس جا کر خبر دی۔ اور انہوں نے جیسے ہو کر ذکیہ کا حال پوچھا۔ ذکیہ نے ملا کی شکایت کی اور محلہ والوں سے بڑھیا کی تجہیز و تکفین کا سامان نہ لکھایا نہ کچھ عتور مٹی دیر میں ہندوستان

ہو گیا۔ اور ذکیہ بھی میت کے ساتھ قبرستان تک گئی۔ دفن سے فارغ ہو کر اس نے دیکھا کہ جو فقیر مسجد کے سامنے ملتا تھا اس کی جھونپڑی اسی قبرستان میں ہے۔ فقیر بہت بڑھاؤ دینی تھا۔ ذکیہ اس کے پاس گئی۔ اور کہا باوا مجھے بھی تھوڑی سی جگہ اپنے پاس دو۔ فقیر نے کہا بیٹی تیرا گھر بے شوق سے رہ۔

یہ فقیر روزانہ بھیک مانگے جاتا تھا۔ اور روٹیاں ٹکڑے نقدی وغیرہ جمع کر کے لاتا تھا میں نے خود بھی کھانا اور ذکیہ کو بھی کھلاتا۔

ذکیہ بھیک مانگتی ہے

چند روز کے بعد فقیر بیمار ہو گیا۔ تو اس نے ذکیہ سے کہا بیٹی اب تو شہر میں جا اور بھیک مانگ کر لا۔ ذکیہ نے دل میں خیال کیا۔ میں سیدانی ہوں اور مجھ کو بھیک مانگنا نہیں ہے۔ مگر اس نے سوچا کہ جب بھیک کے ٹکڑے کھا چکی ہوں تو مانگنے میں کیا شرم مجبوری انسان سے سب کچھ کراتی ہے۔ چنانچہ برقع پہن جھولی ہاتھ میں لے شہر میں چلی گئی جب وہ ایک محلہ میں گئی تو اس نے یہ صدا لگائی۔

”یہ دنیا ناگ پھنی کا پھول ہے جو اس کو چاہے اسکی بڑی بھول ہے
دوساں کی زندگی پر کیوں اتراتا ہے یاد رکھ مرنیکا وقت سانسے
چلا آتا ہے بخلت میں کیوں سوتا ہے اور وقت کی دولت کھوتا ہے۔
اٹھ ہاندھ کمر حل منزل کو۔ اور دیکھ خدا کی محفل کو۔ روٹی کا ڈالہ سالن
میں ڈوب کر گل جاتا ہے دل بھی طمع میں گر کر شل ہو جاتا ہے۔ آگ کا
شعلہ جو پہلے کے اندر ہی گاتا ہے۔ دیکھ خود پرست انگارے کھڑے ہو جاتا ہے
رزق کفہ فی السماء کی رحمت ہے اسی رحمت سے سوال ہے بندہ
کیا دیکھا دینے والا وہ ذوالجلال ہے“

ذکیہ کی اس صدا کی دھوم مچ گئی۔ محلہ کے بڑے لکھے آدمی اس کے آس پاس جمع ہو گئے اور روٹیاں لالاکر اس کی جھولی میں ڈالنے لگے۔ کسی نے کہا بی بی سامنے والے مکان میں جاؤ۔ وہاں آج محرم کی مجلس ہے۔ مجتہد صاحب حدیث خوانی کر چکیں گے تو فقرا کو کھانا تقسیم ہو گا۔ ذکیہ مجلس میں چلی گئی۔ تو اس نے دیکھا ہزاروں آدمی جمع ہیں۔ اور مجتہد صاحب آل محمد کے فضائل اور ان کی خدمت اور محبت کی بڑیاں بیان کر رہے ہیں آخر میں انہوں نے کہا: ”کاشکے ہم لوگ کر بلا میں ہوتے اور اپنے جان و مال کو اہدیت پر نثار کرتے۔ یا بعد کے اماموں کا زمانہ ہی ہو جاتا۔ اور ان کی مصیبتوں کے وقت ہماری جانیں قربان ہوتیں۔ ہم آل محمد کے غلام ہیں۔ ہم آل محمد کے فدائی ہیں۔ ہماری سانچی زندگی ان کے قدموں کے نیچے بچی ہوئی ہے۔ آج یہ تمام کروفر پر سب دھوم دھام آل رسول کی خاطر ہے آج تمام دنیا میں اس وقت تک لاکھوں مقام پر آل محمد کی یادگاریں تعمیر ہو رہی ہیں۔“

ذکیہ نے مجتہد صاحب کی یہ تقریر سنی تو بلند آواز سے کہا سنئے سنئے مجھے کچھ کہنا ہے خلقت نے ذکیہ کو دو کا۔ اور مجھ کو کہا کہ بے ادبی نہ کر۔ اور چپکے رہ۔ قبلہ و کعبہ کے کلام کو پورا ہو جانے دے۔ مجتہد صاحب کے چہرہ پر بھی بل بڑ گیا اور انہوں نے فرمایا کیسی بے تیر محرومت ہے۔ ذکیہ نے کہا خاناہو۔ اب تمہارا بیان ہو چکا اب سکا بیان نہ ہو جس کی مدد و نصرت کے لئے ٹھنڈے سانس بھر رہے تھے۔ میں ماسم شتم کی نشانی ہوں اگرچہ نسل کی ستانی ہوئی بھکارن بے گھری بے دری ذکیہ بیابانی ہوں۔ ذکیہ کی اس تقریر پر ایسا درد تھا کہ جمع پرست ٹاٹا جھا گیا اور مجتہد صاحب سمیت رنج گ حیرت سے اسکی بات سننے لگے۔ ذکیہ نے سب کو مخاطب پا کر یہ تقریر کی۔

مجتہد صاحب اور علیہ ذالوں کو معلوم ہو کہ حسینؑ اور انکی اولاد اب بھی کر بلا کی تکلیف میں مبتلا ہے جینی باغ کے پھول کے پھول آج بھی تم کی دھوپ میں کھلا رہے ہیں۔ اس دنیا کی ہر گلی میں بی بی بی فاطمہؑ کی اولاد خستہ حال ٹھوکر میں کھاتی بھرتی

ہے۔ سیدوں پر آج بھی یزیدی مظالم ٹوٹ رہے ہیں۔ تم لوگ کس
 جھوٹی آہیں بھرتے ہو۔ اگر تم کربلا کے وقت موجود ہوتے۔ تو اسطرح
 آل محمد سے بے خبر رہتے جیسے آج ہو۔ اگر تم پاک اور معصوم اماموں
 کا زمانہ پاتے تب بھی اسی طرح خود غرض نظر آتے۔ اور تم میں ایک
 بھی ان کی مدد نہ کرتا۔

اے مجتہد صاحب تم اور تنہا ری طرح سب پیشوا لوگ ہمارا نام
 لیکر روٹی کھاتے ہو۔ عزت پاتے ہو۔ مہمان اہل بیت مومنین پر حکومت
 کرتے ہو۔ مگر تم میں سے ایک کو بھی بنی فاطمہ کی پریشاں حالی سے ہنسنے کا
 نہیں ہے۔ ان مجلسوں کی دہوم دہام سے تنہا اس فقید دنیا کی ناوری
 ہے۔ آل محمد کی خدمت نہیں ہے۔ یہ میٹھائیاں اور کھلے ہمارے آفت
 میں تقسیم نہیں کئے جاتے ان میں تو تنہا ری دولت کی نمود ہے۔ اور
 دکھاوے کے خیالات ہیں۔ ہمارے نام کی محبت اور ہمارے کام کی
 فدائیت کے خیال سے مومنین تم کو گھر کی دولتیں بخش دیتے ہیں اور
 تم ان کو ذاتی عیش و آرام میں کٹھالتے ہو۔ عمدہ کپڑے عمدہ کھانے
 عمدہ مکان۔ عمدہ سواریاں۔ عمدہ نوکر رکھتے ہو۔ اور آل محمد کی
 بھوک پیاس میں ایک پیسہ تنہا ری حبیب سے نہیں نکلتا۔ بتاؤ بتاؤ
 آج کے دن جولا کھوں مجلسیں ہو رہی ہیں۔ اور ان میں کروڑوں روپیہ
 خرچ ہو رہا ہے وہ آل محمد زندہ اور موجود بنی فاطمہ کے حصہ میں
 کتنا آتا ہے۔ کتنے سادات کی فاقہ کشی دور کرائی جاتی ہے۔ کتنی طبیعت
 کے بچوں کی تعلیم و تربیت میں خرچ ہوتا ہے۔ کس قدر سیدوں اور
 محتاج و بیکس سیدانیوں کی خبر گیری کیجاتی ہے۔ چپ کیوں ہو۔ بولو

جواب دو۔ کیا بول سکتے ہو۔ کیا جواب دے سکتے ہو۔ یا تمہارے دل

نامدہم ہیں۔ اور میری کھری بات نے تم کو شرمندہ کر دیا ہے۔

مجہد صاحب توبہ کرو۔ اور دنیا بھر کے مجہدوں اور ان لوگوں کو پیام

دو جو آل محمد کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اور مہمان آل محمد کی سرگرمیاں

کر رہے ہیں کہ قیامت کے دن رُخِ بخدا تم سے ان جھوٹے وعدوں کی نسبت

جواب طلب کریں گے۔ امیر المومنین حضرت علیؑ اور سیدہ مظلومہؑ کی فاطمہؑ دیتا

فرمایا ہے کہ تم نے ہماری اولاد کیساتھ علیؑ کی محبت بھی ظاہر کی یا محض زانی

باقی بناتے رہے۔“

ذکیہ کی اس تقریر سے سب لوگ ششدر رہ گئے اور کسی کی جرأت نہ بولنے کی ہوئی

اسکے بعد ذکیہ چپکے سے ٹکڑے قبرستان میں چلی گئی۔

کچھ دن کے بعد ذکیہ نے ایک شریف مزاج سید سے نکل کر لیا۔ وہ سید کپڑے کی

نجات کرتے تھے۔ اور ذکیہ کے اصرار سے قبرستان ہی میں انہوں نے مکان بنالیا جہاں

ذکیہ ساری عمر رہی۔ ذکیہ جمعہ کے دن قبرستان میں مسلمانوں کے سامنے دنیا کے انجام پر وعظ

کھا کرتی تھی اور ہزاروں آدمی اسکی نصیحت آمیز پر اثر تقریریں آتے تھے۔ اور یہاں نام نہاد

لوگوں نے ذکیہ بیابانی شہر ہو گیا تھا۔ جواب بھی کہیں کہیں ہی نام سے مشہور ہے۔

دو شہزادہ جیلخانہ میں

میرزا تنیخ جمال کی عمر اب اسی برس کی ہے غدر ۱۳۵۷ء میں وہ انیس برس

برس کے گمروہ جوان تھے۔ اور ان کو غدر سے پہلے کی باتیں ایسی یاد ہیں جیسے ابھی کل کی

گزری ہوئی حالت کو بیان کیا کرتے ہیں۔

تیغ جمال میرزا فخر و ولیہند دوم کے لڑکے ہیں۔ میرزا دارا بخت بہادر شاہ کے پہلے ولیہند تھے۔ لیکن جب ان کا انتقال ہو گیا تو میرزا فخر و ولیہند قرار پائے۔

میرزا فخر و بہت دیندار اور متقی شہزادہ تھے۔ اگر دہلی کا تخت باقی رہتا تو یہ ہندوستان کے بہت ہی نیک بادشاہ مانے جاتے۔ مگر جوانی کے دیوانے پن میں بڑے بڑے پارساؤں کا قدم ڈنگا جاتا ہے۔ میرزا فخر و تو پھر بادشاہ ہند کے بیٹے اور ولیہند تھے جن کو شباب کی آنکھ چھو لیاں کرتے ہیں کسی کا خون دلخا نہ تھا۔ اسکے علاوہ اس زمانہ میں لال قلعہ خانگی بد چلنی میں اس قدر بدنام تھا جس کی کچھ حد نہیں پھر اگر میرزا فخر و سے کوئی غلطی ہو گئی۔ اور وہ جو ش شباب کی سستی کو روک نہ سکے تو کچھ زیادہ گرفت کے قابل نہیں سمجھا جائیگا

میرزا تیغ جمال جیسی پہلی اور خفیہ۔ مگر نہایت دلچسپ غلطی کا نتیجہ ہیں۔ ان کے بعد ان کی والدہ سے پھر کوئی اولاد نہیں ہوئی

تیغ جمال عجب زندہ دل اور خوش طبع شہزادہ ہیں ان کو نشہ و مٹے اور شہزادہ مشہور نہ ہونے کا ذرا بھی غم نہیں ہے۔ اور وہ اپنے والدین کے خفیہ تعلقات کو اس لطفت سے بیان کرتے ہیں گویا ان کا اس عشق بادی کے نتیجہ سے کچھ ذاتی واسطہ ہی نہیں ہے۔ حالانکہ وہ اس چھپی ہوئی اور لال قلعہ کی بیگمات میں نہایت مبالغہ آمیز کیفیات کے ساتھ مشہور عشق بازی کا بولتا ہوا حال مقصد ہیں۔

تیغ جمال کہتے ہیں۔ اماں جان کی عمر سولہ برس کی تھی اور ابا جان تیرہ برس سے کچھ جینے زیادہ کا سن رکھتے تھے۔ جب یہ عشق بازی شروع ہوئی تھی۔ پوچھا جائے کہ جناب تیرہ برس کا بچہ سولہ برس کی عورت سے کیونکر محبت کر سکتا ہے۔ تو سنجیدہ صورت بنا کر کہہ دیتے ہیں جس طرح اتنی برس کا بڈھا سولہ برس کی کم سن عورت سے محبت کا دم بھر اکر آتا ہے۔

ہم مغلوں میں بچے بہت جلدی جوان ہو جاتے تھے۔ لڑکیاں تو بعض اوقات دس اور گیارہ سال کی عمر میں بنو شباب کا اعلان کر دیتی تھیں۔ اور لڑکے بھی بارہ تیرہ برس کے سن میں عشق و محبت اور اُس کے نتائج پر غور و عمل کرنے لگتے تھے میں خود بارہ برس کا تھا تو آجکل کے اٹھارہ سالہ جوانوں سے زیادہ جذبات اپنے اندر پاتا تھا۔

شیخ جمال نے کہا اماں جان ایک کہار کی لڑکی تھیں۔ نانی اماں کو محل کی کہاریوں میں سب سے دیدار و کہار کی کہا جاتا تھا۔ جو حضرت اکبر شاہ ثانی کی نظر کردہ تھیں۔ مگر جو حسن اور جو غمزہ ہائے جانتاں اماں جان رکھتی تھیں وہ نانی اماں کے خواب و خیال میں بھی نہ گزرے ہونگے۔

ہونے کو تو اماں جان بھی محل شاہی کی نوکر تھیں۔ مگر ان کا قیام اکثر خاتم کے باؤا میں رہتا تھا۔ جہاں نانی اماں۔ نانا آبا اور سہاری نہیال کے سب کہار رہتے تھے ایک دن کا ذکر ہے کہ آبا جان ڈیوڑھی کے داروغہ کے ساتھ اپنی کمان دھرت کرانے خانم کے بازار چلے گئے۔ وہاں کہیں اُنھوں نے اماں جان کو دیکھ لیا۔ اور اسی وقت ہزار جان سے عاشق ہو گئے۔ گھر آئے تو اوائی ٹکھٹوائی بے کر پڑ گئے۔ اور رونا شروع کیا ہر چند لوگ پوچھتے تھے کہ میاں مزاج کیسا ہے۔ دادی اماں کہتی تھیں۔ بیٹا کسی نے کچھ کہا ہو۔ سنا ہو۔ کوئی بات مرضی کے خلاف ہوئی ہو۔ تو مجھے بتاؤ میں اس کا تدارک کروں۔ مگر یہ تو عشق کے سائے ہوئے تھے۔ ایک بات منہ سے نہ کہتے تھے۔ اور چپ چاپ بڑے روتے تھے۔

آخر رفتہ رفتہ یہ بات کھل گئی اور محل میں اس کے مذاق اور چرچے ہونے لگے بیگمات آبا جان کو چھیرنے لگیں۔ اور ہم سن لڑکوں میں بھی اشارہ بازیاں اور آواہ کشیاں شروع ہو گئیں۔ رفتہ رفتہ نانی اماں کو خبر ہوئی تو اُنھوں نے اماں جان کو

محل میں بلالیا اور دادی اماں کی ڈیوڑھی پر حاضری لکھوا دی مگر ابا جان کی حالت یہ تھی کہ باوجود اس سر انجام خاص کے وہ اماں جان سے بات کرتے ہوئے شرارتے تھے اماں نے کبھی اکیلے ڈیکھ لے لے جاتیں تو سنسکر ابا جان کا ہاتھ پڑ لیتیں اور کہتیں صاحب عالم آپ غمگین کیوں رہتے ہیں۔ تو ابا جان ہاتھ چھڑا کر بھاگ جاتے اور اماں جان کی طرف مخاطب نہ ہوتے۔

بظاہر تو یہ حالات تھے۔ اندر کی خبر نہیں کیا ہوا۔ اور میرزا تیغ جہاں کیونکر پیدا ہو گئے میرزا تیغ جہاں کا بیان ہے کہ انکی پیدائش کے وقت اماں سترہ برس کی اور ابا چودہ سال کے تھے۔

دادی اماں نے بہت چاہا کہ اب اس کہاری کے ہاں میرزا پوتا پیدا ہو گیا ہے یہ محل میں بیگمات کی طرح رہے مگر نانی اماں نے اس کو قبول نہ کیا۔ اور اماں جان پھر وہیں خاتم کے باور میں رہنے لگیں۔ میرزا تیغ جہاں جب چھ برس کے ہوئے تب وہ لال قلعہ میں اپنے باپ کے پاس آکر رہے وہ کہتے ہیں۔

بجائی ہم کہار میں نہیال کی طرف سے۔ اور بادشاہ ہیں وہ ہیال کے رشتہ سے وہاں بھی انسانوں کا بوجھ اٹھاتے تھے اور یہاں بھی۔ ہماری برابری کون اس دنیا میں کر سکتا ہے کہ ہماری زندگی خدا کے بندوں کے بوجھ اٹھانے اور خدمت خلق کرنے میں بسر ہوتی ہے۔

خدر کے بسین کس بعد

میرزا تیغ جہاں کہتے ہیں۔ خدر کے ایام میں میں اپنی والدہ کے ساتھ دہلی و جاگیر کو ہم شاہ جہاں پور چلے گئے تھے۔ جہاں ہماری نہیال کا مذہبی کنبہ رہتا تھا قلعہ کی افواہ تفری دیکھ کر میں نے شہزادوں کا ساتھ چھوڑ دیا اور اماں کے پاس چلا گیا

کیونکہ شہزادوں کی زندگی اس زمانہ میں دو کوڑی کے برابر بھی نہ تھی۔ مجھ کو جان کی خبر
اسی میں نظر آئی کہ کہاروں میں جا کر رہوں اور کہار کہلاؤں۔
وہ کہتے ہیں کہ اماں جان کے پاس اتنی دولت تھی کہ ہم نے شاہجہانپور میں جا کر
ایک دوکان کر لی اور میں برس بڑے عیش و آرام میں گزارے۔
میں حلوائی کی دکان کرتا تھا۔ ایک دن کسی بٹھان نے مٹھائی کی خرابی میان کر کے
مجھ کو گالی دی۔ میں شاہی خون کا منگل۔ گالی کی برداشت کیونکر کرتا۔ لوہے کا کھچہ
اٹھا کر بٹھان صاحب کے مارا جس سے وہ چکر اکر گر پڑے۔ اور پانچ منٹ کے
اندر ترپ کر مر گئے۔

میں پکڑا گیا۔ اور مدتوں مقدمہ اور رجالات کا جھیلنا برداشت کر کے چودہ
برس کی قید کا سزاوار بنا۔

بریلی کا جیل خانہ

پہلے دن جب میں جیل خانہ کے اندر داخل ہوا تو مجھے ذرا بھی پریشانی اور غم اپنے
قید ہونے کا نہ تھا۔ کیونکہ شروع سے ہر وقت خوش اور بے فکر رہنے کی عادت تھی
اور غم کبھی میرے پاس نہ آئے پاتا تھا۔ قید کا محکم سننے کے بعد بھی میں خوش رہا
اور جب اماں جان ملنے آئیں اور رونے لگیں تو میں نے ہنس کر کہا۔ اے بی۔ تم
رونی کیوں ہو۔ دکان میں اتنی مٹھائی چھوڑ آیا ہوں جو کئی چھینے تک کھائی ہوگی
اماں جان بولیں۔ بس مجھ کو تو ہر وقت مسخرہ پن سو جھتا ہے۔ میرا کون وارث ہے
جو چودہ برس تک خبر گیری کر گیا۔ میں نے تو تیرے دم کی بدولت اس پر دیں
میں سیشن برس گزار دیئے ورنہ دلی کی سی اس گاؤں میں بات کہاں۔ میں نے
جواب دیا۔ جب ابا جان کا سارا خاندان تباہ ہو گیا۔ اور بڑی بڑی حویلیاں گشت

بل گئیں۔ اور ہمارے شہزادے بھائی تخت سے تختہ پر آگئے تو ہم کس گنتی ہیں
 ہیں۔ چودہ سال کی بات ہی کیا ہے پلک مارتے گزر جائینگے۔ اور میں مہتار سے
 پاس آجاؤنگا۔ ذرا میری بیوی کا خیال کھنا۔ اس کا دل مہتاری بد مزاجی سے میل
 نہ ہو۔ تم ملکہ کا دماغ رکھتی ہو۔ اور وہ بچاری محض ایک کہاری ہے۔ جہربانی
 کر کے۔ اس پر شاہانہ مزاج ظاہر نہ کرنا۔ اماں جان یہ گفتگو سنکر ہنسنے لگیں اور یہ کہتی
 ہوئی چلی گئیں۔ خبر نہیں تو اتنا بے غیرت اور ڈہیٹ کیوں ہے خیر خدا کے سہہ کیا
 جس وقت مجھ کو جیل خانہ کے کپڑے پہنے کو دیئے گئے۔ تو میں نے مذاق سے کہا
 اس جائینگے کورہنے دیجئے۔ مجھ کو اپنا پانجامہ اس سے زیادہ پیارا ہے۔ یہ گفتگو
 بر قنداز جیل کو کب گوارا ہو سکتی تھی۔ اس نے دو تین ڈنڈے رسید کئے اور کہا
 یہ مہتاری نانی اماں کا گھر نہیں ہے جو دلگی کی باتیں کرتے ہو۔ میں نے ڈنڈے کھا کر
 بھی سنی کا جواب دیا کہ بھائی نانی اماں کا گھر خاتم کے بازار میں تھا۔ اٹھ محلہ کے
 ساتھ کھود کر برابر کر دیا گیا۔ دادی اماں کا گھر لال قلعہ میں تھا۔ اس میں اب گورے
 رہتے ہیں۔ میں تو اس کو سسرال سمجھ کر آیا تھا۔ وہاں جو تیاں تو مارا کرتے ہیں نہ
 مارنے کبھی نہیں سنے۔ تم میرے سالے ہو یا سسرے۔

بر قنداز آگ ہو گیا اور اس نے دو تین قیدیوں کی امداد سے مجھ کو اتنا مارا کہ میں
 بہوش ہو کر گر پڑا۔ ہوش آیا تو ایک کوٹھری کے اندر لیٹا تھا اور بر قنداز سامنے کھڑا
 تھا۔ میں نے کہا۔ جناب مارے کا شگون ہو چکا۔ اب اپنی بہن کو یہاں لائیے جو مجھ کو کھانا
 دے اور بلدی چو نہ چوٹ پر لگاے۔ بر قنداز کو بے اختیار ہنسی آگئی اور اس نے
 کہا تم آدمی ہو یا بچہ۔ کسی بات کا تم پر اثر نہیں ہوتا۔ میاں یہ جیلتا نہ ہے۔ یہاں یہ
 خوش مذاقیں قائم نہیں رہ سکتیں۔ تم کو چودہ برس گزرتے ہیں۔ سید ہے جو کر
 رہو گے تو خیر ہے۔ در نہ پٹے پٹے چودہ دن کے اندر مر جاؤ گے۔

میں نے کہا مرنے کے بعد بھی آدمی کو قبر کے جیلخانہ میں جانا پڑتا ہے۔ مگر مجھ کو مردہ پر بڑا غصہ آتا ہے کہ وہ کیوں چپ چاپ کفن اور ڈھکے قبر میں چلا جاتا ہے۔ میں تو مرنے کے بعد بھی خاموش نہ ہوں گا۔ اور جو شخص میرے پاس پہنچے گا اس کو بھی ایسا بنادوں گا کہ وہ مرے تو چپکا نہ رہے۔ بلکہ ہنستا بولتا قبر میں جائے۔ مگر تم کو شک ہو تو تم ابھی مر کر دیکھو۔ یا کہو تو میں مار ڈالوں۔

برقنداز نے سمجھا یہ کوئی پاگل ہے، اور ہنستا ہوا باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھ کو چکی خانہ میں لے گئے جہاں ایک چکی پر دو آدمی کھڑے ہو کر آٹا پیستے ہیں۔ میری چکی کا شریک ایک بڑھا آدمی تھا۔ اور شاید نیا نیا قید ہو کر آیا تھا۔ اس واسطے زار و قطار رو رہا تھا۔ میں نے پہلے تو جھک کر ایک فریضی سلام اس کو کیا۔ اور اس کے بعد بولانا انا بابا آپ روتے کیوں ہیں۔ فدوی ایک دو غلی قسم کا آدمی ہے۔ آدھا تیوری ہنڈاؤ اور آدھا کہاں۔ اور جب آپ کے ہمراہ چکی کا کام کرے گا تو تیسری شاخ میرے اندر اور لگ جائیگی۔ اور وہ یہ کہ پاؤں تیوریہ۔

بڑے میاں نے میری بات پر ذرا توجہ نہ کی۔ ان کو اپنی حالت کا اتنا سخت صدمہ تھا کہ آخر مجھ پر بھی اس کا اثر پڑا۔ اور میں نے کہا۔ آپ بیٹھ جائیے۔ میں اکیلا چکی چلاؤں گا۔ اور آپ کے حصہ کا بھی میں ڈالوں گا۔ ان حضرات نے اس کا بھی جواب نہ دیا اور کھڑے روتے رہے۔ لیکن جب برقنداز نے ان کی سفید کتری ہوئی ڈاڑھی پکڑ کر ایک طمانچہ مارا اور کہا میں رو چکا۔ کام کر تو بچا رہے نے آسمان کو دیکھا اور بے اختیار چکی چلانے لگے۔ ان کی اس حالت کا مجھ پر اتنا اثر ہوا کہ اپنی ساری خوشی بھول گیا۔ اور ان کے ساتھ چپ چاپ چکی چلانے لگا۔

کئی روز یہی نوہنت رہی میں ہر خندان سے بات کرتا تھا مگر وہ جواب نہ دیتے تھے اور روتے روتے تھے۔ آٹھ دن کے بعد انھوں نے اپنی مہر گزشت سنانی۔

شاہ عالم کے رٹوتے کی داستان

میں میرزا جہانگیر کا بیٹا ہوں جو اکبر ثانی بادشاہ دہلی کے بیٹے شاہ عالم بادشاہ کے پوتے اور بہادر شاہ کے بھائی تھے۔

جب میرے والد میرزا جہانگیر نے سیٹھن صاحب انگریز کے گولی ماری تو اس قصور کے عوض قید ہو کر الہ آباد بھیجے گئے۔ الہ آباد میں اُنھوں نے ایک عقد کر لیا تھا میری والدہ نظر بندی کے افسر پرہ دار کی لڑکی تھیں۔ نکاح ہونے کے بعد سے لیکر میرا پیدا ہونے تک والد نے میرے نانہ اور والدہ کو اتنی دولت دی کہ سات پٹری کو کفایت کرتی۔ میری دادی اپنے بیٹے کو دہلی سے برابر جوہرات اور اسٹریفیاں بیچا کرتی تھیں۔ اور ان کے پاس دولت کی کچھ کمی نہ تھی۔

میں نے والد کے انتقال کے بعد نانہ کے پاس پرورش پائی اور ایسے ناز و نعمت سے پلا کہ شاید دنیا میں کوئی بچہ میری طرح آرام سے نہ ہو گا۔ ہوشیار ہوا تو ہر قسم کی تعلیم مجھ کو دلائی گئی۔ عربی فارسی کی تکمیل کے بعد میں نے کپڑے کی دکان کر لی۔ دن بھر دوکاندار رہی۔ رات کو خدا کی مہربانی سے تھوڑی عبادت و بیداری میں عمر بسر ہوتی تھی۔ چار بچے خدائے دیے۔ بوڑھی والدہ اب تک زندہ ہیں۔

ایک روز ایک تھانہ دار صاحب کچھ کپڑا خریدنے آئے۔ میں نے عادت کے موافق ایک بات قیمت کی کہ دی۔ اُنھوں نے حجت شروع کی تو میں نے کہا جناب میری دوکان پر جھوٹ نہیں بولا جاتا۔ اس پر وہ بد زبان بگڑ کر بولا۔ بڑا اٹھا۔ تجھ جیسے ٹھگ میں نے بہت سے جیلخانہ میں کھجوا دیئے ہیں۔ میں نے کہا تھانہ دار صاحب رہبان منہ جال کر بولے۔ شریفیوں کی گفتگو ایسی نہیں ہوا کرتی۔ اس پر اس کو اتنا غصہ آیا کہ فوراً ایکس پشٹر مہرے کلہ پر مارا۔ مجھ میں بھی مٹلی خون تھا جو اب میں دیکھتا ہوں۔

میں نے بھی مار دیئے۔ سپاہیوں نے مجھ کو پکڑ لیا اور تھانہ لے گئے۔ وہاں تھانہ دار نے مجھ کو آلات میں بند کر کے میرے گھر کی تلاشی بوالی اور چوری کا کپڑا برآمد کر کے مقدمہ قائم کر دیا۔ ہر چند میں نے اپنی بیگیا ہی ظاہر کی اور حکام سے اصلی واقعات کہے مگر کسی نے نہ سنا اور چھ ماہ قیامت کا حکم دیدیا۔

میری بیوی اور ضیعت والدہ نے گھر کا سارا اثاثہ فروخت کر کے مقدمہ میں صرف کر دیا۔ اور وہ بچاریاں مفلس ہو گئیں۔ لیکن نتیجہ خاک نہ نکلا اور یہاں جیلخانہ میں آنے کی نوبت آگئی۔

سب سے زیادہ مجھے والدہ کا صدمہ ہے۔ جو مجھ سے حالات میں ملنے آئی تھیں اور میری یہ حالت دیکھ کر آہ کا نعرہ مار کر گر پڑیں۔ اور روح پرواز ہو گئی۔ اس وقت میرا بڑا لڑکا جس کی عمر بارہ سال کی ہے ان کے ہمراہ تھا۔ وہ گھر آگیا اور مجھ سے کہنے لگا ابا دادی جان مر گئیں۔ میں چاہتا تھا کہ اماں جان کو جھک کر دیکھوں۔ مگر ظالم داروغہ کے سپاہی مار کر مجھ کو جیلخانہ میں لے آئے اور والدہ کی لاش وہیں پڑی رہ گئی جلتے وقت میں نے اپنے لڑکے کو یہ کہتے سنا۔

ابا جان ہم کہاں جائیں اب یہ سپاہی ہم کو بھی ماریں گے۔ دادی جان کو کیونکر گھر لیجائیں۔ تم ذرا ٹھہرو آجی آجی۔

میں اس غم میں رات دن گھلا جاتا ہوں خبر نہیں بیوی بچوں پر کیا گزرتی ہوگی۔ اور ظالم تھانہ دار نے ان پر کسی کسی زیادتیاں کی ہونگی۔

میرزا تاج جمال نے یہ سن کر ایک تہقیر لگایا۔ اور کہا یہ دنیا بھی عجب مقام ہے میری تہکار ایک سی حالت ہے اور ایک ہی نسل کا تم میں مجھ میں خون ہے۔ مگر تم غم کے تحت الترائیں پٹکتے ہو۔ اور میں خوشی کے آسمان میں زندگی بسر کرتا ہوں۔

واہ وا ایک صورت کا آدمی ایک کھانا ایک پنہا۔ ایک طرح سونا ایک طرح جاگنا

مگر کسی کو عادت ترسنے پر پہننے کی دی۔ کسی کو ترسانے پر پالنے والا بنایا۔ کوئی ہر وقت
مغموم و رنجیدہ رہتا ہے کوئی صبح سے شام اور شام سے صبح تک سوائے ہنسنے ہنسانے
کے کسی غم کے پاس نہیں پھٹکتا۔

بھائی صاحب قیدم بھی کاٹو گئے اور میں بھی کاٹوں گا۔ تم کو یہ زندگی دو بھر
اور اجیرن معلوم ہوگی۔ اور میں اس کو ذرا بھی خاطر میں نہ لاؤں گا اور مرتے دم تک
یوں ہی بشارش بشارش رہوں گا۔ جیسا کہ اب ہوں۔

غذیں سبز پوش عورت کی لڑائی

دہلی کے دو بڑے جو غدر شہداء میں جو ان تھے عام طور سے روایت بیان
کرتے ہیں کہ جس زمانہ میں انگریزی فوج نے پہاڑی پر مورچے بنائے تھے۔ اور کشمیری
دروازہ کے رخ سے دہلی شہر پر گولہ باری کیجاتی تھی۔ ایک بڑا ہی مسلمان عورت سبز
لباس پہنے ہوئے شہر کے بازاروں میں آتی اور بلند اور گرج دار آواز سے کہتی تھی۔

آؤ چلو خدا نے تم کو بہشت میں بلایا

شہر کی خلقت یہ صدا سن کر جو حق اس کے آس پاس جمع ہو جاتی تھی اور وہاں
سب کو لیکر کشمیری دروازہ پر دھاوا کرتی اور شہر والوں کو صبح سے شام تک خوب لڑائی تھی
بعض لوگ چشم دید قصہ کہتے ہیں کہ اس عورت میں غضب کی دلیری تھی۔ اس کو
موت کا کچھ بھی خوف نہ تھا۔ وہ گولوں اور گولیوں کی بوچھاڑ میں بہادر سبائوں

کی طرح آگے بڑھی چلی جاتی تھی۔

کبھی اس کو پیدل دیکھا جاتا تھا۔ اور کبھی گھوڑے پر سوار۔ اس کے پاس تلوار بندوق اور ایک جھنڈا ہوتا تھا۔ بندوق بہت عمدگی سے چلائی جاتی تھی۔ اور جو لوگ اس کے ہمراہ پہاڑی سے موچہ تک گئے ہیں۔ ان میں سے ایک شخص نے کہا کہ وہ تلوار چلانے کے فن سے بھی اچھی واقفیت رکھتی تھی۔ اور بار بار دیکھا گیا کہ اس نے سانے والی فوج سے دست بدست تیغ زنی کی۔

اس عورت کی جرأت و ہمت کو دیکھ کر شہر کے عوام میں بڑا جوش پیدا ہو جاتا تھا اور وہ بڑھ بڑھ کے حملے کرتے تھے۔ مگر لڑائی سے ناواقف ہونے کے سبب عموماً ان کو بھاگنا پڑتا تھا۔ اور جب وہ بھاگتے تو یہ عورت ان کو بہت روکتی اور آخر مجبور ہو کر خود بھی واپس چلی آتی۔ مگر واپس آنے کے بعد پھر کسی کو معلوم نہ ہوتا کہ وہ کہاں چلی جاتی ہے۔ اور پھر کہاں سے آتی ہے۔

آخر اسی طرح ایک دن ایسا ہوا کہ وہ جوش میں بھری ہوئی حملہ کرتی بندوق مارتی تلوار چلائی موچہ تک پہنچ گئی۔ اور وہاں زخمی ہو کر گھوڑے سے گری۔ انگریزی فوج نے اس کو گرفتار کر لیا۔ پھر کسی کو معلوم نہ ہوا کہ وہ کہاں گئی اور اس کا کیا حشر ہوا۔

عذر کے ایک انگریز افسر کی شہادت

صوبہ دہلی کی گورنمنٹ نے انگریزی کے چند خطوط چھاپے ہیں۔ جو ایام محاصرہ دہلی میں انگریزی فوج کے افسروں نے لکھے تھے۔ ان خطوط میں ایک خط افسر ڈبلیو ایس ہڈسن صاحب کا ہے۔ جو انھوں نے دہلی کیسے ۲۹ جولائی ۱۸۵۷ء کو مڑے گلے فارمانہ ڈپٹی کمشنر انبالہ کے نام بھیجا تھا۔ اس خط میں مسلمان بڑھیا کی کیفیت پر روشنی پڑتی ہے خط کا اردو مفہوم یہ ہے۔

تمانی ڈیر فار سائے۔ میں تمہارے پاس ایک بڑھیا مسلمان عورت کو روانہ کرتا ہوں یہ عجیب کم کی عورت ہے۔ اس کا کام یہ تھا کہ نیر لباس پہن کر شہر کے لوگوں کو بجاوت پر آمادہ کرتی تھی۔ اور خود ہتیار باندھ کر انکی کمان کرتی ہوئی ہمارے موچہ پر حملہ لاتی تھی۔

جن سپاہیوں سے اسکا سابقہ پڑا ہے وہ کہتے ہیں کہ اس نے بارہا دلیرانہ اور مردانہ حملے کئے۔ اور سعی سے ہتیار چلائے۔ اور اس میں پانچ مردوں کی برابری طاقت ہے۔

جس روز گرفتار ہوئی۔ اس دن یہ گھوڑے پر سوار تھی۔ اور شہر کے باغیوں کو فوجی ترتیب سے لڑا رہی تھی۔ اس کے پاس بندوق تھی جس سے اس نے بہت سے نظمیہ کش اور سپاہی کہتے ہیں کہ تلوار اور بندوق کے وار سے خود اس نے ہمارے بہت سے آدمی قتل کر ڈالے مگر عین کہ امید تھی اسکے ساتھی بھاگ گئے اور یہ زخمی ہو کر گرفتار ہوئی۔

جنرل جیکوئل نے پیش ہوئی تو انہوں نے عورت سمجھ کر اسکے رہا کر دینے کا حکم دیا مگر میں ان کو روکا اور کہا کہ اگر یہ رہا ہو گئی تو شہر میں جا کر اپنی باطنی اور غیبی طاقت کا دعویٰ کریگی اور ضعیف الاعتقاد لوگوں کو اسکی رہائی کسی مخفی اثر کا نتیجہ معلوم ہوگی۔ اور ممکن ہے کہ اس سے یہ عورت فرانس کی اس مشہور عورت کی طرح ہمارے واسطے باعث تکلیف

ہو جائے جس کا ذکر انقلاب فرانس کی تاریخ میں مذکور ہے۔ انقلاب فرانس کے ایام میں ایک عورت اسی طرح دشمنوں سے لڑتی تھی۔ اور ہزاروں آدمی اس کو غیبی اور آسمانی

قوت کا ظہور سمجھ کر اسکے ساتھ ہو گئے تھے جس سے بڑا سخت کشت خون ہوا تھا اور عوام اسکو ناقابل ہلاکت تصور کرنے لگے تھے آخر فرانس کی حریف فوج نے اس کو زندہ جلا دیا تھا۔ جب یہ قندہ دیا تھا۔ اسی عورت کی طرف خط میں اشارہ کیا گیا ہے جس نظامی

جنرل صاحب نے میرے شورے کو قبول کیا اور اس عورت کے قید کرنے کی تجویز دلائی بائی لہذا انکی خدمت میں اس کو روانہ کیا جاتا ہے۔ امید ہے کہ آپ اسکی حواس متعقول بندوبست کریں گے۔ کیونکہ یہ ڈالین بہت ہی اندیشناک عورت ہے۔ ہڈیں ۵

سبز پوش عورت کی حقیقت

دہلی کی عام روایتوں اور اس سرکاری افسر کے خط کی تصدیق کے بعد میں نے بہت کوشش کی کہ اس سبز پوش عورت کی حقیقت معلوم ہو جائے۔ مگر قابل اطمینان بیان ایک بھی میسر نہ آیا۔ جو لوگ اس عورت سے واقف ہیں وہ اسی قدر بیان کر سکتے ہیں کہ پچھلے اس کو جوش دلاتے اور عوام کو جمع کر کے لڑائے کو لیجاتے دیکھا۔ اس کا زیادہ ہم کچھ نہیں جانتے کہ وہ کون تھی اور کہاں سے آئی تھی۔

البتہ ایک قصہ ایسا ہے جو اس واقعہ سے تھوڑا بہت متعلق معلوم ہوتا ہے ممکن ہے کہ وہی عورت ہو جس کا ذکر کرنا مقصود ہے۔

ریاست ٹنک کے ایک صاحب نے بیان کیا کہ ان کے والد حضرت حاجی لال محمد صاحب چشتی نظامی کے مرید تھے۔ حاجی صاحب حضرت مولانا فخر الدین چشتی نظامی ہلوی کے خلیفہ تھے۔ اور ان کا مدار درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے مشرقی دروازہ میں داخل ہوتے ہی تنگ مرم کے ایک کٹھرے میں نظر آتا ہے۔

ٹنک کے راوی کا بیان ہے کہ میرے والد حاجی صاحب کے ہاتھ پر مقام اجمیر شریف مرید ہوئے تھے۔ اور جو وقت انھوں نے سمیعت کی تو ایک مجذوب نما عورت حاجی صاحب کی خدمت میں بھیجی تھی اور کہہ رہی تھی کہ میرے لئے شہید سونے کی دعا مانگو۔ اسکی درخواست کو الفاظ تو بالکل ہوش و حواس میں ادا ہوتے تھے۔ مگر اسکی حرکتیں بواؤں کی سی تھیں۔

حاجی صاحب نے دیر تک کچھ جواب نہ دیا اور آخر جوش میں کر فرمایا۔

”منفس پر جاؤ کر کہاں سے بڑھ کر کوئی جنگ نہیں ہے“

عورت نے کہا تو کیا منفس چھو قتل کر گیا۔ جب شہادت پاؤنگی تو منفس کو قتل کر گئی اور منفس کے غلاموں سے شہادت لوگئی۔

اس پر حاجی صاحب نے تبسم فرمایا۔ اور کچھ دیر تک سوت کر کے ارشاد کیا۔

”ہمدی کے پتے سبز ہیں۔ مگر باطن سُرخ ہو سکتے ہیں۔ جا بھر ہوا و سُرخ بن“

یہ استعارہ ہم سب لوگوں کی سمجھ میں نہ آیا۔ مگر وہ عورت قدموں پر گر پڑی اور انکو بوسہ دیکر کہیں چلی گئی۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ اس نے حضرت حاجی صاحب کا مطلب سمجھ لیا۔ اور جو چاہتی تھی وہ اس کو مل گیا۔

کچھ عرصہ کے بعد میں نے اس عورت کو درگاہ حضرت خواجہ قطب صاحب میں دیکھا۔ کہ سبز لباس پہنے ہوئے حضرت مولانا فخر صاحب کے فرار پر مراقب بیٹھی ہے جب وہ فاض ہوئی تو میں نے اس سے پوچھا کہ تم وہی عورت ہو جسکو میں نے اجیر فریفت میں دیکھا تھا تو اس نے کہا ہاں بھائی میں وہی ہوں اور تمہاری پیروی میں ہوں۔

میں نے کہا آہا کیا تم بھی حضرت حاجی صاحب سے بیعت ہو۔ بولی ہاں میں انہی کی نوٹدی ہوں میں نے پوچھا تمہارا مکان کہاں ہے اور یہ درویشی کب سے لی تو اس نے اپنا قصہ اس طرح بیان کیا۔

میرے دادا احمد شاہ ابدالی کے لشکر میں سردار تھے جب مرہٹوں سے پانی پت پر لڑائی ہوئی ہے تو وہ اس میں موجود تھے۔ اور اسی میں شہید ہوئے۔ میرے والد بھی احمد شاہ کی فوج میں تھے۔ مگر انکی عمر اسوقت بہت چھوٹی تھی اپنی بیوہ والدہ کے ہمراہ کچھ دن لاہور میں رہے اور اس کے بعد ریاست بھاو لپور چلے گئے۔ جہاں سمولی لوکی سے گزرا وقت کی اور وہیں انکی شادی ہوئی میرے دو بھائی ہوئے تھے۔ مگر ذرہ ذرہ ان کے بعد میں پیدا ہوئی۔ اور ابتدائی عمر بھلا لپور میں گزری اس کے بعد والدین کے ہمراہ ریاست جے پور میں آگئی۔ جہاں میرے والد نے نوکری کر لی تھی۔ یہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ اور میں نے راجہ صاحب کے ایک مسلمان چوہدرے سے شادی کر لی۔

ہندالولی کا حکم

میراثو ہر بار تھا۔ اور زندگی کی کچھ امید نہ رہی تھی۔ میں اس کے سر پر ہاتھیں دھائی
مانگ رہی تھی کہ بے اختیار میری زبان پر ہندالولی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا نام
آیا کہ اسی ان کے صدقہ سے میرے خاوند کو اچھا کر دے دعا کرتے کرتے میں سو گئی تو
خواب میں دیکھا۔

چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے اور خلقت بچانے کو اسپربانی ڈالتی ہے تو وہ پانی
ہی آگ کا شعلہ بن کر برتنوں سے نکلتا ہے۔ میں اس منظر کو دیکھ کر گھبرائی۔ تو سامنے ایک
بزرگ کو کھڑا دیکھا جو فرماتے ہیں۔ اری او عورت اپنا سر قربان کر جب یہ آگ فرو ہو گی۔
میں نے عرض کیا۔ کیونکر سر کو قربان کروں۔ ان بزرگ نے فرمایا کیا تو شہید ہونا نہیں چاہتی
یہ کہہ انھوں نے ایک بزرگ چادرہ جھکو دیا کہ اس کو اوڑھ لے۔ میں نے جوں ہی اس کو اوڑھا ہوا
میں لڑ گئی۔ جوں جوں ادب اڑتی تھی چاروں طرف سے آوازیں آتی تھیں کہ یہ شہید
یہ شہید ہے یہ منسنے ہی آنکھ کھل گئی۔

دیکھا تو شوہر سکرات میں تھا۔ اور اسی میں اس کی رحلت ہو گئی۔

خاوند کے مرنے سے مجھ کو بہت صدمہ ہوا۔ اور میں کچھ دیوانی سی ہو گئی اور اجہ میرٹھ
جا کر رہنے لگی۔ وہیں حضرت حاجی صاحب کی زیارت نصیب ہوئی اور میں نے ان سے بیعت
کر لی۔ اب میں اکیلی تھی۔ کیونکہ والدین پہلے مر چکے تھے۔

اس دن سے میرے دل میں بھی سمائی ہے کہ ہندالولی خواجہ اجہ میرٹھ نے مجھ کو شہید ہونے
کا حکم دیا ہے۔ اور خواب میں انہی کی زیارت مجھ کو میر آتی تھی۔

اب میں دہلی کی زیارتیں کرنے آئی ہوں۔ اور زیادہ حصہ دادا پیر (یعنی حضرت مولانا
فخر صاحب) کے مزار پر رہتی ہوں۔

ہر سوں دادا پیر صاحب خود خواب میں آئے تھے۔ اُنہوں نے فرمایا تو سبز پوش
نہیں ہے۔

ٹونگ والے صاحب کا بیان ہے کہ اس عورت کی یہ عجیب باتیں سُکر میں اُس
چلا آیا اور اُس سے کچھ دن بعد دہلی میں غدر ہو گیا۔

اِس حکایت سے خیال ہوتا ہے کہ شاید وہ سبز پوش عورت جس کا ذکر غدر دہلی
کے قصہ میں آیا ہے یہی ہو۔ اور اسی نے اپنے دماغی جنون کے باعث یہ حرکت کی ہو۔

قدرت کے اسرار

اگر واقعی غدر میں انگریزی فوج سے لڑنے والی اور عوام کو لڑائی پر آمادہ کرنے والی
یہی عورت تھی تو تاریخ میں یہ ایک عجیب قصہ سمجھا جائیگا۔
مگر میرا خیال ہے کہ ٹونگ والے صاحب نے جس عورت کا قصہ بیان کیا۔ وہ اس عورت
سے جو غدر دہلی میں ہندو اور ہونی قیادہ مناسب نہیں کہتا۔

کیونکہ حاجی لال صاحب کی مرید عورت گوسپاہی کی پوتی اور بیٹی تھی۔ مگر ایسے اقصا
موجود نہیں ہیں جن سے یہ ثابت ہو کہ اس نے ہندوؤں اور تلوار چلانا سیکھا۔ نہ ایسی
وجوہات معلوم ہوئیں جو سبز پوش عورت کو گھوڑے پر سوار ہونے اور لڑائی کے قواعد جاننے
کی شہادت دے سکیں۔ ایک ایسی عورت جسکی بیان شدہ زندگی میں کہیں بھی فوجی معرفت
کا ذکر نہیں پایا جاتا کیا ایک ایسی تو عداواں اور گھوڑے سوار ہتھیار چلانے والی گھوڑے
بن گئی۔ لہذا میں سمجھتا ہوں کہ غدر کی لڑاکا عورت کوئی اور ہوگی۔ جس کو حاجی لال صاحب
کی مریدہ سے کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا۔

البتہ ایک خفیف شبہ اسکا ہو سکتا ہے کہ حاجی لال صاحب کی مریدہ بوجہ بیٹھوٹی سپاہی ہونے
اور شہادت کے خیال میں غور ہنے کے سبب ممکن ہے غدر کے ہنگامہ سے متاثر ہوئی ہو اور باقی

افواج میں شریک ہو کر اس نے گھوڑے کی سواری اور ہتھیار چلانا سیکھ لیا ہوا اور فوجوں کے
 نزار کے بعد جوش شہادت میں از خود رفتہ ہو کر دہلی کے عام شہریوں کو لڑائی پر آمادہ کیا ہوا۔
 یا ممکن ہے کہ غدر کے بانی لوگوں نے ایک نیم عقل اور شہادت کی شوقین عورت کو
 شکار کیلئے کی ٹٹی بنالیا ہوا۔ اور ابھی کی سسی سے اس نے لڑائی کے ہنر سیکھے ہوں۔
 بہر حال یہ عورت کوئی بھی ہو۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اس کا واقعہ قدرت کے سراسر
 میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ اور غدر کی تاریخ لکھنے والوں نے اگر اس عجیب قصہ کو نہیں لکھا
 تو ایک دلچسپ حصہ چھوڑ دینے کا جرم ان سے سرزد ہوا۔

ایشیا اور ہندوستان میں مذہبی عقائد اور بعض اوقات محض خیالی توہمات ایسے ایسے
 شاندار کام کرتے ہیں جنکے سامنے عقل و تدبیر حیران رہ جاتی ہے۔

اگر غدر کی سبز پوش عورت سے۔ بلوہ فساد کے علاوہ کسی جائز فوجی کام میں مدد لجاتی
 یا اس کو تاریخ میں کوئی اور کام کرنے کا موقع ملتا تو اس کا نام بھی چاند بی بی اور رضیہ بیگم
 اور نور جہاں کی طرح مشہور ہو جاتا۔

مجلو مشرہٹن کی اس تحریر سے اتفاق ہے کہ اگر جنرل صاحب اس سبز پوش عورت کو
 رہا کر دیتے اور مشرہٹن کا کہنا نہ مانتے۔ تو یقیناً وہ عورت انگریزی فوج کو کسی دوسری
 صورت سے عرصہ کا زینک پریشان کرتی۔ اور کچھ مشکل نہ تھا کہ وہ ہندوستان میں کبھے بکھے
 جوش انقلاب کو پھر ایک نئی صورت سے زندہ کر دیتی۔ پھر اس دوسرے نظام کا مقابلہ انگریزوں
 کو آسان نہ ہوتا اور معلوم نہیں حالات کیلئے کیا ہو جاتے۔

میں چاہتا ہوں کہ اور کسی ہندوستانی کی نظر سے کسی انگریزی یا دہلی تاریخ میں اس
 سبز پوش عورت کا قصہ گزرا ہو۔ اور میرے بیان سے زائد حالات معلوم ہو ہوں تو وہ مجھ کو
 مطلع فرمائیں۔ تاکہ میں تاریخ غدر دہلی میں ان کو درج کر دوں۔

سبز پوش عورت کو ہر ہندوستانی۔ اس کی دلیری اور جرأت اور مردانہ فوجی کمائن کے

واقعہ کو فخر سے یاد رکھنا پسند کر لیا۔ اور چاہیگا کہ اس عورت کے اور حالات بھی معلوم ہوں۔ تاکہ ہندوستان کا فخر ایک جائز حد کے اندر ہمیشہ برقرار رہے۔

کہنی

”دشا دگدگیاں نہ کر۔ مجھے سولے دے، نماز قضا ہوتی ہے تو کیا کر دے آنکھ کھولنے کو جی نہیں چاہتا۔“

”بیوی گدگدیاں سننے نہیں کیں یہ گلاب کا پھول تھا رس تلوں سے آنکھیں مل رہا ہے۔“
”میل میں پھول کو مسل ڈالوں گی۔ اتنے سویرے مجھے کیوں جگاتی ہے۔ میرا دل ابھی سوچا کو چاہتا ہے۔ ذرا سدری کو بلا بانسی بجائے۔ ہلکے سروں میں بھیر دیں مٹائے۔ گل چین کہاں ہے چچی کرے۔ تو کوئی کہانی شروع کر۔“

”کہانی کہوں گی تو مسافر راستہ بھولیں گے۔ دن کو کہانی نہیں کہنی چاہئے۔ سدری حاضر ہے گل چین کو بلاتی ہوں۔ اماں جاں آجائنگی تو خفا ہوگی کہ مہ جال کو اب تک بیدار نہیں کیا نماز کا وقت جاتا ہے۔“

سدری بانسی بجا رہی تھی کہ مہ جال نے آنکھیں کھول دیں باؤں کو سمیٹا۔ سکرانی بکھر پڑا۔ فرگس نے سلام کیا۔ جواب میں اُسے ایک چٹکی لگی انکڑائی لیکر اُٹھ بیٹھی اور کہا۔
”دشا د۔ سمجھنے فرگس کے چٹکی لی تو پہنسی نہیں۔ منہ بنا لیا۔ آ تو آ۔ تیرے کان مڑوڑوں اور تو خوب پنس۔“

دشا د اُٹھ کر بھاگی دور کھڑی ہوئی اور کہا۔ ”لیجئے میں کھلکھلا کر سنہتی ہوں آپ سمجھ لیجئے کان مڑوڑ دیئے۔“

مہ جال نے پھر انکڑائی لی۔ اور سکرانی ہوئی طشت چوکی پر گئی۔ وضو کیا۔ نماز پڑھی صحن میں نکلی بارغ کے پاس تخت پر بیٹھی۔ قرآن شریف شروع کیا سب لونڈیاں فرسٹ

ورستی میں مصروف ہوئیں۔ ناشتہ کا سامان کرنے لگیں۔

مرہ جمال تلامذت سے فارغ ہوئی تو مالن چنگیر میں چند ہری مرچیں لئے حاضر ہوئی پہلے
مرہ جمال کی بلائیں لیں دعائیں دیں۔ پھر بولی: ”سرکار آج حضور کے لگائے ہوئے پودوں
میں یہ مرچیں لگی تھیں نذر کے لئے لائی ہوں“

مرہ جمال نے چنگیر لے لی۔ سب لونڈیوں کو پکارا۔ اور مرچوں کی آمد سے محل میں ایک
دھوم مچ گئی۔ سترگس نے کہا کیسی ہری ہری چکنی چکنی صورت ہے۔ ”دشا دبولی“ جیسے بیوی کو
محال۔ ”سندری“ نے کہا کیسی چپ چاپ چنگیر میں لیٹی ہیں جیسے بیوی چھپر کھٹ میں سوتی ہیں
گلچمن بولی: ”ڈالی سے ٹوٹی ہیں گھر سے چھوٹی ہیں اسلئے ذرا چپ چپ ہیں“
مرہ جمال نے کہا: ”مالن کو جوڑا دو کپڑے پہناؤ۔ پانچ روپے نقد بھی دینا۔ سیر دڑھوں
کا پہلا پھل لائی ہے۔ اس کا منہ بھی میٹھا کرنا“

مالن کو ریشمی جوڑا ملا۔ چاندی کے کپڑے پہنائے گئے۔ لڈو کھلائے گئے پانچ روپے
نقد اور ایک پان کا بیڑا ملا۔ وہ دعائیں دیتی ہوئی اپنے گھر گئی۔ یہاں اماں جان کو لونڈی
عجرب دینے پہنچی کہ بیوی کے دختروں کا پہلا پھل آیا ہے۔ وہ برابر کے مکان سے آئیں غلانی
ساتھ تھیں۔ بیٹی کی بلائیں لیں۔ مرہ جمال نے آداب کیا۔ اماں اور غلانی نے مرچوں کی خوب
تقریفیں کیں اور تھوڑی دیر تک مرچوں کا غلغلہ گھر میں برپا رہا۔

مرہ جمال خورشید جمال کی اکلونی بیٹی تھی۔ اس کے والد میرزا علی گوہر عرف نیلی
شاہ عالم کے بیٹے اکبر شاہ ثانی کے بھائی تھے جو مرچکے تھے۔ خواصوں سے ان کے کئی
بچے تھے مگر بیگم سے صرف مرہ جمال ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی۔ اور وہ بھی بڑھاپا آجانی کے
بعد جب میرزا نیلی مرے ہیں تو مرہ جمال کی عمر پانچ سال کی تھی۔ اب ماشار اللہ پندرہویں
سال میں ہے۔ صورت سانولی ہے چہرہ کتابی ہے۔ قد میانہ ہے آنکھیں سیاہ اور بچہ سلی
اور محمور ہیں۔ آواز میں قدرتی درد ہے جب ہنسر بولتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی

مرثیہ پڑھا گیا۔ شکر کلیجے پر چوٹ لگتی ہے۔ وہ بہت چنچل۔ شوخ آرام طلب و نازک مزاج ہے لاؤ پیار میں پلایا ہے۔ شہزادی ہے ابن باپ کی ہے۔ اکلوتی ہے اور کچھ خطرناک بھی اور ہٹیلی ہے۔ بدن بہت دبلا ہے۔ چلتی ہے تو غیر مصنوعی انداز سے بدن کو جھکاتی۔ پھولوں کی ٹہنی کی طرح ادھر ادھر جھکولے کھاتی ہوئی چلتی ہے ٹھوکریں قدم قدم پر لگتی ہیں۔ لونڈیاں ساتھ دوڑتی ہیں بسم اللہ یا اللہ خیر کہتی جاتی ہیں پھول والوں کی سیر تھی۔ بہادر شاہ اپنے نئے محل میں جو درگاہ حضرت خواجہ قطب صاحب کے دروازہ کے قریب بنا تھا۔ تشریف رکھتے تھے۔ سیکیٹ اندر تھیں۔ مگر خورشید جمال اور مرہ جال نے دوسرا مکان لیا تھا۔ کیونکہ میرزا علی کے وقت سے انکی اور بہادر شاہ کی اہلی تھی۔ بہادر شاہ کو انگریز لاکھ روپیہ مہینہ دیتے تھے۔ اس میں سے ایک ہزار روپے مہینہ خورشید جمال کا علیحدہ بھیجا جاتا تھا۔ ساٹھ سو تھار روپے آجکل کے لاکھ روپیہ کی برابر تھے۔ اور خورشید جمال خوب عیش آرام سے زندگی بسر کرتی تھیں۔ جس شام کو پنکھا چڑھا۔ مرہ جال عصر کے وقت سے برآمدہ میں جلین کے پاس بیٹھی تھی۔ انگریزی بج رہی تھی۔ دہلی کے ہندو مسلمان زرق برق کپڑے پہنے پنکھے کے ساتھ تھے۔ دوکانیا آراستہ تھیں۔ سٹے کٹورے بجا رہے تھے۔

مغرب کا وقت آیا تو خورشید جمال نے لونڈیوں سے کہا بھیا کہ پہلے آن کرنا زبردہ لو پھر تماشا دیکھنا۔ مرہ جال اٹھی تو چلتے وقت اُس نے دیکھا ایک فقیر سہلکد کھنی پہنے زرد چہرہ ننگے سر ننگے پاؤں پہنکے۔ کے پاس سے گزر کر اس کو دیکھتا ہوا چلا گیا۔ اس کی صورت اور کھنی دیکھ مرہ جال ڈر گئی۔ نمازیں بھی اسی کا خیال رہا۔ سیر سے فارغ ہو کر سوئی تو رات کو بھی کھنی کھنی دفعہ خواب میں دکھائی دی۔ صبح ہوئی تو ہلکا ہلکا بخار تھا۔ ماں کو خبر ہوئی اس نے کچھ پٹھ پٹھ کر دم کیا۔ صندوچ سے ایک نقش نکال کر گلے میں ڈالا۔ فقیر دل کو خیرات بھجوائی۔

دوپہر کو بخاریز ہنگیا۔ مہ جال چونکتی تھی اور کہتی تھی ”وہ کفنی والا آیا۔ وہ عجبو
بلا تا ہے۔ اماں جی آنا وہ دیکھو کھڑا سکر اتہے“

ماں نے لونڈیوں سے پوچھا۔ اُنھوں نے کہا۔ ایک فقیر کل شام کو کفنی پہنے جاتا
تھا بیوی نماز کے لئے اُٹھیں تو چلن کا پردہ ہٹ گیا۔ فقیر نے ان کو گھور کر دیکھا۔ او
بیوی نے اس کو دیکھا۔ اس کے بعد وہ کہیں چلا گیا۔

خورشید جال نے نوکروں کو حکم دیا کہ اس حسیلیہ کا فقیر جہاں ملے اس کو لاؤ۔ نوکر
سارے میلے میں ڈھونڈتے پھرے۔ شام کے قریب وہ فقیر ملا۔ اس کو ساتھ لیکر مرگیا
پر آئے۔ خورشید جال نے پردہ کے پاس بٹھا کر لڑکی کا حال کہا۔ وہ بولا مجھے اندر لیچلو
میں دم کر دو نگا اچھی ہو جائیگی۔

خورشید جال نے اندر پردہ کرایا۔ فقیر کو پلنگ کے پاس کھڑا کیا۔ اُس نے آنکھ
بند کر کے دونوں ہاتھ اپنے رخساروں پر رکھے۔ اور کچھ دیر چپ کھڑا رہا۔ اور پھر کہا
”لو لڑکی اچھی ہو گئی“

دیکھا تو واقعی بخاریز گیا تھا۔ مہ جال اُٹھ بیٹھی۔ خورشید جال اور سب لونڈیاں
حیران ہو گئیں۔ فقیر کو بٹھایا کچھ روپے اور کپڑے کے دو تھان نذر پیش کئے فقیر نے
کہا ”میں نہیں لیتا مجھے لڑکی کی صورت دکھا دو ورنہ پھر مجار ہو جائیگی“

خورشید جال نے پہلے تو کچھ تامل کیا مگر پھر خیال آیا کہ فقیر تو ماں باپ ہوتے ہیں
پردہ نہ دیا۔ مہ جال نے فقیر کو دیکھا اور سہ جھٹکا لیا۔ فقیر نے مہ جال کو دیکھا اور
برابر دیکھتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد ”بھلا ہو بابا“ کہہ کر اُٹھا اور چلا گیا۔

یہ تیس برس کا جوان تھا۔ مگر بیلر معلوم ہوتا تھا۔ چہرہ پر زردی بہت زیادہ تھی سفید
کفنی کے سوا کوئی کپڑا پاس نہ تھا۔ آنکھیں ایسی معلوم ہوتی تھیں گویا وہ روتے ہوئے گئی ہیں
یہ شخص اُس الماں کا بیٹا تھا جو مہ جال کے باغ کی محافظ تھی مہ جال کو ایک سال پہلے

اُس نے باغ میں دیکھا تھا۔ اپنی غیبی اور مہ جال کی شان کا خیال کر کے اسکو مہبت نہ ہوتی تھی کہ اس تکلیف کو کسی کے سامنے بیان کرے جو مہ جال کے دیکھنے سے خود بخود اس کے اندر پیدا ہو گئی تھی۔

چھ مہینے وہ اس خلیان میں پریشان رہا۔ اس کے بعد اس کو ایک ہندو جو گیلا جس سے اُسے اپنا حال بیان کیا۔ جو گیلا ایک سفید کفنی دی کہ اسکو پہن لے تیرے سلیم پورے ہو جائیگے۔ کفنی پہننے ہی وہ نیم مجزوب ہو گیا اور گھر بار چھوڑ کر جنگل میں نکل گیا جہاں پہنے تک جنگلوں میں پھر تارہا۔ چھ ماہ کے بعد اب وہ پھر آبادی میں آیا تھا جہاں اُس نے پھر مہ جال کو دیکھا۔ مگر اب اس کے دیکھنے میں ایسی قوت پیدا ہو گئی تھی کہ مہ جال کو اس تلے ایک نگاہ میں بیکار دیا ۴۴ ستمبر ۱۸۷۵ء کو ایک تھ بخت گڈھ کے قریب کھڑا تھا۔ اور خاکی در دی کے فوجی سپاہی اسکو گھیرے ہوئے تھے۔ یہ بشت کرت تعلق رکھتے تھے اس تھ میں خورشید جال مہ جال اور دو لونڈیاں سوار تھیں باہر چار لوکر تلواریں لئے کھڑے تھے۔ فوج والے کہتے تھے ہم اندر کی تلاشی لیں گے۔ اس میں کوئی باغی پوشیدہ ہے۔ سلیم کے نوکر کہتے تھے۔ اندر عورتیں ہیں ہم پردہ نہ کھولنے دیں گے۔ نوبت لڑائی کی پہنچی نوکروں نے تلوار چلائی اور وہ سب ایسے لڑے کہ ایک بھی زندہ نہ بچا۔ فوجیوں نے رتھ کا پردہ الٹ دیا۔ عورتوں کو دیکھا اور زیور کا صندوق ان سے چھین لیا۔ اس کے علاوہ اور جب قدر اسباب تھا وہ بھی لٹکے آگے بڑھ گئے۔ رتھ بان بھاگ گیا تھا۔ سلیم لونڈیوں کو لیکر بخت گڈھ کی طرف چلیں کہ اترو میں چند گوجر لٹھے ہوئے آئے اور ان سے زیور اور کپڑے مانگنے لگے سلیم نے کہا کہ تو فوج والوں نے لوٹ لیا ہے۔ اب ہمارے پاس کچھ بھی باقی نہیں ہے۔ تم رتھ اور سہیل لے لو۔ مگر گوجر نہ مانے اور اُسمنوں نے زبردستی اُنکے برقعے اُتار ڈالے۔ پانچا جال کے سوا تمام کپڑے چھین لئے۔ خورشید جال اور لونڈیوں نے ان کو برا کہنا شروع کیا۔ ایک گوجر جس نے خورشید جال کے سر پر لکڑی ماری اور دوسرے نے لونڈیوں پر لکڑیوں کے وار کئے مہ جال

دوری سہی چپ کھڑی تھی۔ اسکو کسی نے نہ چھیڑا۔ خورشید جمال کا سر صیٹ گیا اور وہ تڑپ کر گر گئی۔
 لونڈیاں بھی دونوں چوٹ کے منہ سے تمام ہو گئیں۔ مہ جمال اکیلی کھڑی تماشہ دیکھتی تھی ماں کو
 مرنے دیکھا تو چٹکر رونے لگی۔ گوجر تو مار کوٹ کر چلے گئے اور مہ جمال روتے روتے بیہوش ہو گئی
 ہوش آیا تو اُس نے دیکھا نہ اس کی ماں کی لاش نہ نہ لونڈیوں کی لاشیں ہیں۔ نہ وہ گل
 ہے بلکہ وہ ایک گھر کے اندر چار پانی پر لیٹی ہے۔ سامنے ایک گائے بندھی گھڑی ہے چند
 مرغیاں صحن میں پھر رہی ہیں اور ایک میواتی چالیس پچاس برس کی عمر کا سامنے بیٹھا اپنی
 بیوی سے باتیں کر رہا ہے۔ مہ جمال کو پھر دنا آ گیا۔ اور اُس نے میواتی کی بیوی سے مخاطب ہو کر بولا
 ”میری ماں کہاں گئیں“ میواتی نے کہا ”وہ گرہیں تھیں نکود فن کر دیا گیا۔ تم کو یہاں لائے ہیں تم
 کچھ کھاؤ گی۔ لو کھیر پلے ہے کھاؤ“

مہ جمال نے کہا مجھے بھوک نہیں ہے۔ اور بھکیاں لے لیکر رونے لگی۔ میواتی پاس لگی اور اس
 دلا سا دینا شروع کیا اور کہا بیٹی صبر کرو نے سے کیا ہوتا ہے۔ اب تیری ماں زندہ نہیں ہو سکتی
 ہمارا سلا دہ نہیں ہے بیٹی بنا کر رکھینے۔ اس گھر کو اپنا گھر سمجھ۔ تو کون ہے تیرا باپ کہاں ہوا اور
 تو کہاں جاتی تھی“

مہ جمال نے کہا ”میں لی کے بادشاہ کے خاندان میں ہوں۔ میرے آبا جان گیارہ برس ہو
 مر گئے ہم غدر کی بھاگڑ میں گھر سے نکلے تھے بخت گدھ میں ہمارے باغ کا مالی رہتا ہوا اسکے
 گھر میں جانا چاہتے تھے کہ راستہ میں پہلے فوج والوں نے لوٹا۔ پھر گوجروں نے اماں جان لو
 دو لونڈیوں کو مار ڈالا“ کہتے کہتے وہ پھر رونے لگی۔

چندر روز مہ جمال میواتی کے ہاں رام سے دن گزارتی رہی کہ چودہ پچھلے وقت کو یاد
 کر کے روتی تھی لیکن میواتی کی محبت کے سبب اسکو کسی بات کی تکلیف نہ تھی کئی کئی روٹی
 مل جاتی تھی تمام مہ جمال کو یہ گھر اور اسکی سادگی کاٹے کھاتی تھی اور وہ پچھلے زمانہ کا عیش نہ آتا تھا۔
 ایک شات کو مہ جمال اور میواتی اور اس کا خاوند اپنے مکان میں سوتے تھے کہ پڑوس کے

ایک چھپرہ کی لگ گئی اور وہاں سے بڑھ کر ان کے چھپرہ میں بھی آن لگی۔ وہوہیں کی بو سے محل کی آنکھ کھل گئی۔ اور وہ چنچتی ہوئی اُنھی میواتن اور میواتی کا کچھ زور گھر کے اندر رکھا تھا وہ اس کو لینے کے لئے اندر بھاگے اور مہ جال گھر کے باہر بھاگی۔ کوٹھے کا جلتا ہوا چھپرہ گر پڑا اور وہ دونوں اس کے اندر جھک کر گئے قصبہ والوں نے بمشکل آگ بجھائی۔ مگر مہ جال کا یہ ٹھکانا بھی خاک کا ڈھیر بن کر رہ گیا۔

صبح جلی ہوئی لاشیں قصبہ والوں نے دفن کیں۔ اور مہ جال کو ایک نمبر دار اپنے گھر میں لے گیا۔ اس کے کئی بچے تھے اور دو بیویاں تھیں۔ مہ جال کو ایک چار بابائی سونے کو دید گئی وہ دن تو گزر گیا۔ رات کو ایک بیوی نے کہا: "اری لڑکی دودھ چو لھے پر رکھ بے"۔ دوسری بولی: "اری ادھر آ میرے بچے کو سلا دے"۔ ایک وقت میں دو حکم شکر مہ جال ذرا گھبرا گئی۔ اس نے کبھی دودھ چو لھے پر رکھا تھا نہ کسی بچے کو لوریاں پیکر سلا یا تھا۔ تاہم وہ دودھ اٹھا کر چو لھے پر رکھنے چلی۔ چو لھے کے قریب کر ٹھوکر لگی۔ ہانڈی ہاتھ سے گر پڑی اور ٹوٹ گئی دودھ سب بکھر گیا۔ آواز سن کر نمبر دار کی بیوی دوڑ پڑی اور دودھ گرا ہوا دیکھ کر ایک دہشت گرد جال کے ماری اور گالیاں دینی شروع کیں۔

مار کھانے اور گالیاں سننے کا یہ پہلا موقع تھا۔ مہ جال کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی دودھ اس کے کپڑوں پر بھی گرا تھا کبھی وہ کپڑوں کو دیکھتی اور کبھی نمبر دار کی بیوی کو دیکھتی جو لگاتار گالیاں بک رہی تھی۔

آخر وہ دیوار کے سہارے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اور بے اختیار رونے لگی مہ جال کو روتا دیکھ کر نمبر دار کی بیوی کو کچھ غصہ آیا۔ اور اس نے جوتی نکال کر دو تین جوتیاں اس کے چہرہ پر مار دیں اور کہا: "اب تو مجھ کو رو کر ڈراتی ہے بموی ڈائن میواتن کو کھا گئی اب یہاں کس کو کھانے آئی ہے میرا سارا دودھ پھینک دیا خدا کے میرے بچوں کو دودھ کا چو لھے کے سامنے گرنا بڑا غصہ ہے"۔

خبر نہیں تیرا آنا کیا مصیبت لایا گیا

سہ جمال کے چہرے پر جو تیاں پڑیں تو وہ بلبلا اٹھی اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے
چھپایا۔ اتنے میں منبردار آگیا اور اس نے جو یہ شور غل سنا تو وہ بھی وہاں آیا۔ جمال
وہاں سے بھاگ کر اپنی چار پائی کے پاس گئی منبردار اور اس کی بیوی بھی دالان میں آئے
منبردار نے بیوی سے پوچھا کیا ہوا تھا۔ اس نے سارا قصہ بیان کیا۔ اس نے کہا چلو غریب جانے دو
غریب عورت ہے خطا ہو گئی۔ کچھ خیال نہ کرو۔ دوسری بولی۔ یہ غریب نہیں ہے بڑی قسط
ہے میں نے آواز دی کہ دریا کے کوسلادے تو کالوں میں بول مار کر چپ ہو گئی۔ اور سنی
ان ٹی کر دی۔ اسکو تم بیگم بنا کر لے ہو یا تو کرنا کہو تو کہہ دے تو اسکو کام کرنا پڑ گیا۔
منبردار نے کہا میں تو لاوارث سمجھ کر لایا ہوں۔ اس کو کام کرنا چاہئے۔ ہم کو ایک کر عورت
کی ضرورت بھی تھی۔

سہ جمال نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ بھلا آج تک نوکری کرنی نہیں آتی تھی۔ تم مجھ کو سکھانا
تقدیر نے یہ وقت تو مجھے ڈالا مگر نوکری کرنی نہ سکھائی۔ میرے سامنے تو نوٹریاں
کام کرنی تھیں میں نے تو کبھی کچھ کام نہیں کیا۔ یہ کہتے کہتے اسکو ایسا رونایا کہ بچی بند گئی۔
منبردار نے کہا۔ تو رومت رفتہ رفتہ سب کام آجائیگا۔ اس کے بعد کچھ کھانے کو
دیا۔ مگر سہ جمال سے کھانا نہ گیا اور وہ یونہی پڑ کر سو گئی۔ صبح کو منبردار کی بیوی نے زور سے
جھنجھڑا اور کہا اری اٹھتی نہیں کبتک سو گئی۔ جھاڑو دینے کا وقت ہے۔

سہ جمال کو یاد آیا کہ دلدادہ نرگس۔ سندری کس طرح جگایا کرتی تھیں یا وہ وقت تھا
یہی وقت ہے۔ تھنڈا سانس بھر کر اٹھی اور جب دت دو چار اٹھ گیا۔ آیاں لیں۔

منبردار کی بیوی نے دھک دیکر کہا۔ نخوت پھیلاتی ہے اٹھتی نہیں۔ اس وقت جمال نے
جانا کہ اب میں واقعی لونڈی بن گئی ہوں شہزادی نہیں رہی فوراً اٹھی۔ مگر آئو لگاتار
اسکی آنکھوں سے برہے تھے۔ منبردار کی دوسری بیوی نے کہا۔ اس عورت کا گزر ہمارے
گھر میں نہ ہو گا ہر وقت روتی ہے۔ بال بچوں کے گھر میں بس منجوس کا رکھنا اچھا نہیں۔

اتنے میں مہر دار آگیا۔ اور اُس نے بیوں کے بکنے سے مہ جمال کو کھڑے کھڑے گھر سے نکال دیا۔ مہ جمال حیران پریشاں کھڑی تھی اور کہتی تھی۔ یا اللہ کہ ہر جاؤں اتنے میں اسکو اپنی مالن کا خیال آیا کہ وہ اسی قصبہ میں رہتی تھی اور اماں اسکی ہاں ٹھیکو گھر سے آئی تھیں مہ جمال یہ خیال کر رہی تھی کہ اتنے میں وہی کفنی والا فقیر سامنے سے آیا اور مہ جمال کو دیکھ کر کھڑا کھڑا رہ گیا۔ مہ جمال پر بھی اس ناگہانی ملاقات کا بہت اثر ہوا اور وہ بھی کچھ گم صدم سی ہو گئی۔ اگرچہ وہ ایسی مصیبت کے حال میں تھی کہ اُس کو تن بدن کا ہوش تھا تاہم فقیر اور اُسکی کفنی اور سکی زرد صورت اور لال آنکھوں کا ایسا اثر اُس پر ہوا کہ تمام بدن میں سنسنار مٹ ہونے لگی۔

فقیر نے کہا: میری ملکہ تم یہاں کہاں؟ مہ جمال نے میری ملکہ کا لفظ سنا تو سچا طے منہ پھیر لیا اور کہا: مجھ کو تقدیر یہاں لے آئی ہے۔ اور پھر سارا قصہ بیان کیا۔ اُس نے کہا: میرا گھر تو قریب ہی ہے مگر میں نے کبھی تمہارا حال نہ سنا چلے میرے گھر پر چلے۔ مہ جمال اُس کے پیچھے پیچھے چلی۔ وہ اپنے گھر میں گیا اور مالن سے مہ جمال کا حال کہا وہ دوڑی ہوئی آئی اور مہ جمال کے قدموں میں گر پڑی اور پروانوں کی طرح اُس پر کچھ صدقے قربان ہونے لگی۔ اس کے بعد بڑی عزت سے چار پائی پر لیجا کر بٹھایا اور حالات پوچھتی رہی۔ اور کہا: یہ گھر آپ کا ہے میرا بیٹے کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ آپ کے گھر کی بدولت خزانے والا مال کر رکھا ہے۔ اب آپ اس گھر کی مالک ہیں اور میرا بیٹا آپ کے لونڈی غلام ہیں۔

مالن نے اپنی حیثیت کے موافق اہل قدر آرام مہ جمال کو پہنچایا کہ وہ مصیبتوں کو بھول گئی۔ اس نے دیکھا کہ مالن کے لڑکے کے پاس دو دو در سے بیار آتے ہیں وہ پہلے اپنی کفنی پر ہاتھ ملبس ہے۔ پھر اپنے دونوں خساروں پر لٹو رکھتا ہے اور آنکھیں کچھ دیر بند رکھ کر پھر کھول دیتا ہے اور کہتا ہے کہ جاؤ تم اچھے ہو یہ سب آں کی آن میں چمے ہو جاتے ہیں۔

مرہ جال کئی روز تک یہ تماشا دیکھتی رہی تو اُس نے مالن سے پوچھا "تیرے لڑکے میں یہ طاقت کہاں ہے آگئی اس نے مجھ کو بھی ایک دن اسی طرح اچھا کر دیا تھا،" مالن نے ہاتھ جوڑ کر کہا "بیوی جان کی امان پاؤں تو کہوں۔ مرہ جال نے کہا: اب میں جان کی امان دینے کے قابل نہیں ہوں۔ تم کہو مجھے اس بھید کے معلوم کرنے کا شوق ہے؟" مالن نے کہا: "بیگم میرے لڑکے کو تم سے محبت ہو گئی تھی اور تمہارے فراق میں اس نے بہت دکھ اٹھائے۔ آخر ایک فقیر نے اس کو یہ کفنی دی۔ یہ اسی کی برکت ہے جس سے ہزاروں کو فیض پہنچ رہا ہے۔ اور خدا نے گھر بیٹھے تم کو بھی یہاں بھیج دیا۔" مرہ جال پر اس خبر کا بہت اثر ہوا۔ اور کچھ دن کے بعد اس نے مالن سے کہکرتا ہنی کو بلا لیا اور کفنی پوش سے نکاح کر لیا۔

مالن نے تمام عمر مرہ جال کی ایسی خدمت کی اور ایسی محبت سے اس کو رکھا کہ وہ کہتی تھی کہ "مجھ کو اپنا بچن بھی یا د نہیں آتا" گویا مالن کے لڑکے نے کفنی پہننا کبھی ترک نہ کیا۔ اور اس کی کفنی کا فیض دُور دُور مشہور ہو گیا۔ اور اس طرح مرہ جال کی سو فی قسمت کفنی نے جگا دی۔

جب میں شہزادہ تھا

بہنی کے بھنڈی بازار میں مغل ہوٹل کے برابر ایک بڑا آدمی بیہوش پڑا تھا آنے جانے والوں نے پہلے خیال کیا کہ کوئی تھکا ہوا مسافر ہے جو اتنا تھکا ہے جو بھنڈی بازار کی ان پتھریں جہن پر پیدل کا راستہ ہے صبح کے وقت سینکڑوں پرہی مسافر جہن کو مکان میں نہیں پڑے سو یا کرتے ہیں۔ لیکن جب دس بجے اور بڑا بیدار نہ ہوا تو پہرہ والے سیاہی قریب آ کر دیکھا۔

بڑا بہت کمزور اور ناتوان تھا چکی ڈارمی۔ بھوں ٹک کے بال سفید چہرہ پر جھریاں
آنکھیں اندر کو دھسی ہوئیں بدن ہلکے سیلا کرنا جس میں کئی پیوند ٹانگوں میں گاڑے کا پاجامہ
سپاہی نے پہنے تو جگنا چاہا اور جب وہ نہ آیا تو قریب آکر غور سے اسکی صورت
دیکھی اور بولا۔ یہ تو شاید مر گیا۔ دو تین راہ گیروں نے جھک کر بڑے کو کروٹ دی اسکا
چہرہ دیکھا تو معلوم ہوا۔ سانس تو رہا ہے مگر کسی وجہ سے وہ بیہوش ہے۔

سپاہی نے ایک وکٹوریہ گاڑی والے کو آواز دی اور بڑے کو اٹھا کر اس میں لاوا
اور جے جے ہسپتال میں لے گیا۔ پارسی ڈاکٹر نے بڑے کو دیکھ کر کہا۔ اسکو کسی نے کچھ کھلا دیا ہے
وہ راز کرچہ کا اب اس کا علاج مشکل ہے۔ پھر بھی اس بے کوشش شروع کی۔ تھوڑی دیر کے بعد
بڑے کو ہوش آیا۔ اور اس نے کہا بیٹی تو کہاں چلی گئی۔

بڑے کی آواز اسقدر ناتوان تھی کہ کمپنڈر کے سو آکسی نے نہ سنی اس لئے اُس نے کہا اس
تو ابل ہسپتال میں ہے۔ میری بیٹی یہاں نہیں ہے۔ بڑے نے پھر مری ہوئی دھیمی آواز میں کہا میں نے
سات وقت سے کچھ نہیں کھایا مجھے کچھ کھانے کو دو۔ میری بیٹی نے کئی دن سے خبر نہیں لی وہ
مجبور وہی کھلا کرتی تھی۔ خبر نہیں وہ کہاں چلی گئی۔

کمپنڈر نے ڈاکٹر سے یہ حال کہا ڈاکٹر نے شور بابتویز کیا جو تھوڑا تھوڑا کر کے اسکو
پلایا گیا۔

جب بڑے میں ذرا جان آئی تو پولیس والوں نے اس کے اظہارے کیونکہ تھا سکا
محرم اس کی بیوی میں ایک پیرا کر کے چلا گیا تھا جب اس کو خبر ہوئی کہ بڑے کو ہوش
آ گیا ہے تو وہ پھر آیا اور اس کے حالات دریافت کئے۔

بڑے نے کہا میں چار چھینے سے مہی میں رہتا ہوں۔ میرا کوئی مکان نہیں ہے
سڑکوں پر گزارہ کرتا ہوں۔ میری ایک بیٹی بچانے کی نوکری کرتی ہے۔ وہ کھیت بارتی ہے
ایک طوائف کے ہاں تو کرتی اور صبح شام جھکوا اپنے حصہ کے کھانے میں سے آدھا کھا کر

اگر دے جاتی تھی۔ مگر چار دن سے نہیں آئی جس مکان پر وہ نوکری میں وہاں بھی گیا اور
رندھی سے اس کا حال دریافت کیا۔ اس نے کہا وہ تو دس دن ہوئے ہماری نوکری چھوڑ
کہیں چلی گئی۔ یہ سنکر میں نے اس کو اور کئی جگہ ڈھونڈا۔ مگر وہ کہیں نہ ملی۔ جب چھ وقت
کا قافہ ہو چکا اور مجھ میں چلنے کی طاقت نہ رہی تو میں جھنڈی بازار کی شرک پر رات کو
لیٹ رہا اور بیہوش ہو گیا۔

تھانہ کے محرر نے پوچھا۔ تم تو بھیک مانگتے تھے پھر کیوں بھوکے رہے۔ مہی شہر میں
بھیک مانگنے والے بی۔ اسے پاس لوگوں سے زیادہ کما لیتے ہیں۔

بڈے نے محرر کی یہ بات سنی تو اس کو اس قدر طیش آیا کہ آنکھیں حلقوں سے اُبل پڑیں
اور اس نے اپنی کمزور آواز حلق سے بہت زور کے ساتھ باہر نکال کر کہا۔ بس جناب
چپکے رہئے۔ زیادہ کہو اس نہ کیجئے شاید آپ نے اپنے باوا کے ساتھ جھکو بھیک مانگتے دیکھا ہو
محرر کو ایک شکستہ حال لکھنے کی یہ بات تیرہ سو گر لگی اور اس نے بڈے کے ایکٹل پنچ
مارا۔ بڈہ حاطا پنچ کھا کر چپٹ کر پڑا۔ مگر فوراً اُٹھا اور ڈاکٹر صاحب کا رول میز سے
اُٹھا کر محرر کے سر پر مارا جس سے محرر کا سر پھٹ گیا اور وہ غش کھا کر گر پڑا۔ لوگوں نے
بڈے کو پکڑ لیا۔ ورنہ وہ دوسرا وار اور کرنا چاہتا تھا۔

ڈاکٹر نے محرر کو ڈرینگ روم میں لیجا کر اس کے زخم کو دھویا اور دوا لگائی۔
سپاہی بڈے کو لیکر تھانہ پہنچا۔ یورین انسپکٹر وہاں موجود تھا جب اس نے بڈے کے
حالات سے تو اس کو بھی بہت عصہ آیا۔ مگر اس نے کہا۔ محرر کی بیان تک اس کو حوالہ
میں نہ کہو۔

شور یا پکڑ بڈہ بہت تیز ہو گیا تھا۔ اور محرر کو برابر مڑا بھلا کہہ رہا تھا۔
زخم پر پٹی باندھے ہوئے محرر تھانہ میں آیا۔ اور انسپکٹر کو واقعات کی رپورٹ سنائی
اس نے بڈے کو حوالہ سے نکال کر پھر اس کے بیانات لکھنے شروع کئے۔

بڑے نے کہا میں بیان اس وقت دوں گا پہلے آپ کے محرر صاحب مجھ سے معافی فرمائیے
انہوں نے مجھ جیسے عزت دار کو بھیک منگا لیا کہو کہا۔
محرر نے کہا کیوں کہتا ہے بڑا عزت دار آیا کہیں سے خود تو کہتا تھا کہ میری بیٹی رندی
کے ہاں نوکر کھتی اور اب عزت دار بنتا ہے۔ تو بھیک منگا نہیں ہے تو کوئی ٹھگ یا
ڈاکو ضرور ہے۔

بڑے پر پھر غصہ کی لہر طاری ہوئی اور قریب تھا کہ وہ محرر پر دوبارہ حملہ کرے۔ لیکن بیٹی
نے اس کو یکدلیا اور انسپکٹر نے بڑے کو دھمکایا کہ خبردار اپنی جگہ کھڑے رہو ورنہ اچھانہ ہوگا۔
بڑے نے کہا تو کیا آپ ایک شریف آدمی کو گالیاں دلو انے کو یہاں لائے ہیں میں شاہ
دہلی کا خون ہوں تو ہرگز کسی کی گالی دے دوں گا۔ اور اپنی جان اس کی جان ایک کر دوں گا۔
شاہنشاہ دہلی کے خون کا لفظ سن کر انسپکٹر کھنسی آگئی اور اس نے محرر سے کہا یہ تو بالکل
معلوم ہوتا ہے تم اس کو بچنے دو۔

اس کے بعد انسپکٹر نے بڑے سے سوالات کرنے شروع کئے۔

تمہاری بیٹی کی عمر کتنی ہے۔ بڑے نے جواب دیا وہ میں سال کی ہے۔ گروہ میری بیٹی
بیٹی نہیں ہے۔ میں نے اس کو پالا ہے۔ میں نے اس کی شادی کر دی تھی۔ مگر اس کا خاوند نکاح
کی وبا میں مر گیا۔ وہ آدمی پیر بھائی کے کارخانہ میں نوکر تھا۔ میری لڑکی نے بھوپال میں خیر
تو وہ اس کو دیکھنے بمبئی آئی میں بھی اس کے ہمراہ آیا۔ یہاں آکر وہ اپنی کا خرچ پائن تھا
اس لئے چار مہینے سے ہم بمبئی میں ہیں۔ میری بیٹی نوکر کی کرتی ہے۔

انسپکٹر نے کہا تم بھوپال میں کیا کام کرتے تھے۔ بڑہا بولا میں ایک میر کے دروازہ پر چوکیدار
تھا۔ میری لڑکی اسی امیر کی چوکر تھی۔ میں نے اس کو بیٹی بنالیا تھا۔

انسپکٹر نے پوچھا۔ شاہنشاہ دہلی کا خون تمہارے اندر کے دن سے آیا۔ کیونکہ ابھی تم کہتے
تھے کہ میں شاہنشاہ دہلی کا خون ہوں۔ ایک ٹکے کا چوکیدار یہ کیونکر دعویٰ کر سکتا ہے۔

بڈے نے مسکرا کر کہا جب تم یہاں آئے میں چوکیدار بن گیا ورنہ تمہارے آنے سے پہلے میں شہزادہ تھا۔ انیسٹر بڈے کے مسکرائے سے بگڑا اور اس نے کہا کہ میرے آنے سے پہلے اگر تم شہزادہ تھے تو اتنی جلدی چوکیدار کیونکر بن گئے۔ میرے سامنے پاگل پنہ کی باتیں نہ کرو۔ میں تمہاری حقیقت کو جانتا ہوں۔ تم بڑے ہوشیار بد معاش ہو۔ بڈے نے بیباک مٹنی تو پھر اس کے چہرہ کارنگ بدلا۔ مگر اس نے بہت ضبط کے ساتھ جواب دیا جی ہاں آپ میری حقیقت سے واقف ہیں اور میں آپ کی حقیقت سے واقف ہوں۔ میں نے ابراہیم لودی کا گھر لوٹا تھا اس واسطے میں بھی بد معاش ہوں۔ آپ نے میرے گھر لوٹا لہذا آپ بھی بد معاش ہیں۔ انیسٹر غصہ سے بیباک ہو گیا۔ مگر اس نے اپنے مزاج کو قابو میں رکھ کر کہا تمہارے گھر میں کتنا سونا چاندی تھا جس کو میں نے لوٹ لیا۔ بڈے نے جواب دیا جتنا سونا چاندی بابر اور ہمایوں نے ابراہیم لودی کے گھر سے لوٹا تھا وہ سب آپ کے قبضہ میں ہے۔

انیسٹر نے کہا تو کیا تم بابر کی اولاد ہو، بڈا بولا ہاں۔ میں بابر کی اولاد تھا۔ مگر آپ چوکیدار ہوں۔ نہیں بلکہ آپ کا قیدی ہوں۔

انیسٹر نے اس کے بعد کچھ نہ کہا اور حکم دیا۔ اس کو حوالات میں لیجاؤ۔

(۲)

بہمنی میں منلیہ خاندان کے ایک شہزادہ رہتے تھے۔ گیر و الباس تلامذہ لگائے ہوئے انگریزی حکام سے بہمنی کا مانا جتنا تھا۔ انیسٹر نے ان کو بلایا اور کہا ایک شخص دعویٰ کرتا ہے کہ میں دہلی کے شاہی خاندان سے ہوں۔ کیا تم اس کو پہچان سکتے ہو۔ کیونکہ تم کو بھی دعویٰ ہے کہ میں شہزادہ داراجخت ابن بہادر شاہ بادشاہ کا بیٹا ہوں۔

یہ شخص حوالات کے قریب گیا اور بڈے چوکیدار کو دیکھ کر بولا جو بڑا ہی شہزادہ نہیں ہے حوالات کے اندر سے بڈے نے کہا نہیں بلکہ تم شہزادہ نہیں ہو۔ انیسٹر نے پوچھا تم کس دلیل

کہتے ہو کہ حوالات والا بڑا دہلی کے شاہی خاندان سے نہیں ہے۔ وہ بولالیل کچھ نہیں ہے
میں اپنے خاندان کے سب لوگوں کو جانتا ہوں۔

حوالات کے اندر سے بڑا بولا۔ میں تم سے عمر میں زیادہ ہوں اور اپنے خاندان کا حال
تم سے زیادہ معلوم ہے۔ بتاؤ۔ جب بہادر شاہ گرفتار ہو کر رگوں گئے تو ان کے ہمراہ کون
کون گیا تھا۔ بیٹی والی شہزادہ لے گیا جو ان بخت اور میں اور زینت محل۔ اور بہادر شاہ
ایک ٹم میں اور زینت محل دوسری میں جو ان بخت اور میں۔ منزل بہ منزل کلکتہ گئے۔ دہلی
واجہ علی شاہ نے مونیوں کا تعالٰیٰ نذر بھیجا۔ مگر انگریزوں نے اس کو پیش نہ ہونے دیا
کلکتہ سے ہم رنگوں گئے اور بہادر شاہ کی رحلت کے بعد میں بیٹی چلا آیا۔

حوالاتی بڑے نے منہ سر کہا بھی جھوٹ ہے کہ بادشاہ اور زینت محل ٹم ٹم میں تھے
دہلی کے بیچ بیچ کو محاصرہ ہے کہ یہ دونوں پالکی میں تھے۔ ایک پالکی میں جو ان بخت اور
زینت محل تھے۔ دوسری میں تاج محل عقیں تیسری میں خود بادشاہ تھے۔ ان کے سوا کوئی
شخص ان کے ہمراہ نہ تھا۔

بیٹی والا شہزادہ کچھ گھر آ گیا۔ کہو نکلا اس نے فرغی داستان اپنے شہزادہ ہونے کی
بیٹی میں مشہور کر رکھی تھی۔ اور لوگ اس کی عورت کرتے تھے۔

بڑے حوالاتی نے اور بھی چند سوالات کئے مگر کسی کا ٹھیک جواب بیٹی والے شہزادہ نہ دیا۔
الیکٹرک گھر ابواب میں رہا تھا اس کو یقین ہو گیا کہ حوالاتی بڑا سچا ہے اس لئے
اس نے اس کو حوالات سے نکال لیا اور سامنے کرسی پر بٹھا کر حالات دریافت کرنے لگا
کہ غدر سے اتنا تک اس پر کیا کیا گذری۔

(۳)

حوالاتی بڑے نے کہا میں میرزا خضر سلطان کا بیٹا ہوں جو بہادر شاہ کے بیٹے تھے
اور جن کو غدر کے بعد گولی سے قتل کر دیا گیا۔ غدر میں میری عمر اٹھارہ سال کی تھی غدر کے

زمانہ میں مجھ کو پیش ہو رہی تھی۔ چار بیٹے لگاتار بیمار رہا جس نے میرے والد کو خفا کر دیا
میں ہمایوں کے مقبرہ میں تھا۔ شام کو جب خبر آئی کہ میرزا اسفل اور میرزا خضر سلطان وغیرہ
قتل کر دیئے گئے۔ تو میری والدہ بھگو اور میری چھوٹی بہن کو لیکر فرید آباد کی طرف روانہ
ہوئیں کیونکہ وہاں ہمارے دو نوکروں کا گھر تھا۔

جب ہماری بیل گاڑی پور پونجی تو میرزا حسن اور میرزا الہی بخش نے سوار لاکر، کھو گھیر لیا
گھاڑی کی تلاش کی اور مجھ کو گرفتار کر لیا۔ میری صورت مردوں کی ہو رہی تھی۔ خون کے ست
آئے تھے۔ والدہ نے رو رو کر کہا یہ بہت بیمار ہے اس کا کچھ قصور نہیں ہے۔ یہ تو جہاں
بیٹے سے گھر میں پڑا ہوا ہے۔ ہر سن صاحب نے کہا مگر اس کے باپ نے انگریزوں کے
بچوں اور عورتوں کو قتل کرایا تھا ہم اس کو قید کر کے تحقیقات کرینگے اگر یہ سبکنا ہوا
تو چھوڑ دیں گے ورنہ اس کو قتل کیا جائیگا۔ میری بہن مجھ سے بہت مانوس تھی اس نے
مجھ کو خفا دیکھا تو روتی ہوئی ددڑی اور مجھ کو چمٹا گئی صاحب نے اس کو زبردستی
ہٹا دیا اور مجھ کو ایک سوار کے پیچھے بٹھا کر دہلی کے کیمپ میں لے آئے۔

میں والدہ اور بہن سے جدا ہوا تو وہ دونوں زار و فقار کھڑی ردتی تھیں والدہ نے
روتے روتے اتنا کہا۔ بیٹا جان سے بچ گئے تو جلدی صورت دکھانا جاؤ اللہ بلی اللہ بکبان۔
تحقیقات کے زمانہ میں مجھ کو سمندر خاں پنجابی سپاہی کے پاس رکھا گیا تھا جو بڑا ظالم شخص
تھا میں حبش کے سبب گھڑی گھڑی پاخانہ جاتا تھا۔ جب میں فافع ہو کر آتا تو وہ کہتا جاؤ کو
اپنے ہاتھ سے صاف کر دو۔ پہلی دفعہ میں نے انکار کیا تو اس نے دو تین طمانچے میرے ماتے
مزدوری کے سبب مجھ کو غصہ آگیا اور تمام رات بھر بھی چڑھا رہا اسی حالت میں پاخانہ جاتا
تھا۔ چکر آتے تھے مگر گڑبڑا تھا۔ مگر مجبوراً پاخانہ کو ہر دفعہ صاف کر کے باہر ڈالنے جاتا تھا ایک دفعہ
میں نے کہا مجھ کو جنگل میں جانیکی اجازت دیجئے تاکہ صاف کرنے کی تکلیف سہجے جاؤں تو اس
ظالم نے کہا شاید مجھ کو گئے کا ارادہ ہو گا۔ تم جنگل میں نہیں جا سکتے۔

کھانے کو بھی بہت خراب غذا ملتی تھی جس سے پیچش بڑھ گئی تھی چار دن کے بعد محکو بڑے انگریز کے سامنے پیش کیا گیا۔ گامی خاں مجرکی گواہی ہوئی۔ جس نے بیان کیا کہ یہ لڑکا اپنے باپ میرزا حشر سلطان کے ساتھ پہاڑی پر لڑنے جاتا تھا۔ اور لال قلعہ میں جو انگریزوں کے بچے اور عورتیں قتل کئے گئے اس وقت بھی یہ موجود تھا۔ اور اسی نے زنا نہ محل سے باہر آکر کہا تھا کہ بادشاہ نے ان لوگوں کے قتل کا حکم دیدیا ہے۔

بڑے صاحب نے یہ گواہی منکر میری پھانسی کا حکم دیا۔ میں نے کہا اس گواہ سے تو یہ پوچھئے کہ پہاڑی پر باغی فوج کے ساتھ جاتے ہوئے یا لال قلعہ میں زنا نہ محل سے باہر آئے ہوئے اس خود محکوم دیکھا تھا یا نہیں مٹائی کہتا ہے۔

گامی خاں نے کہا میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ میں نے پوچھا جرنل ڈگلس صاحب قلعہ دہرا دے گئے ہیں تم کہاں تھے۔ گامی خاں کا چہرہ فی ہو گیا۔ اور اس نے گردن جھکا کر اور کچھ دیر کے بعد کہا میں اس روز اپنے گھر میں تھا۔ میں نے کہا تم جھوٹ بولتے ہو تم خود وہاں باغیوں کے ساتھ موجود تھے اور تم ہی نے باغیوں کو ڈگلس صاحب کے قتل پر ابھارا تھا میں اس وقت وہاں موجود تھا۔ کیونکہ والد نے نجیپس کے علاج کے لئے ڈگلس صاحب کے ہمارے ڈاکٹر صاحب کے پاس محکو بھیجا تھا۔ تم نے صاحب و مریم صاحبہ و دھانوں کے قتل کے بعد چاندی کا ایک گلدان اٹھالیا تھا۔ اور صاحب کی گھڑی بھی تم نے لی تھی۔ گامی خاں نے کہا جھوٹ ہو میں وہاں نہیں تھا۔ مگر اس کے چہرہ پر ایسی گھبراہٹ تھی کہ بڑے صاحب کو شبہ ہوا اور انھوں نے حکم دیا کہ گامی خاں کے گھر کی تلاشی لیجاؤ۔ چنانچہ اسی وقت دوڑ بھیجی گئی اور کچھ دیر کے بعد گھڑی اور گلدان لئے ہوئے سپاہی واپس آئے۔ اور اس کے علاوہ ہزار ہا توڑ کا اور بھی قیمتی سامان اس کے گھر میں نکلا۔

صاحب نے یہ دیکھ کر گامی کو پھانسی کا حکم دیا۔ اور محکور ہا کر دیا۔ قید سے چھوٹ کر میں فرید آباد آیا۔ مگر یہاں تکرم معلوم ہوا کہ والدہ اور بہن یہاں نہیں ہیں چنانچہ تلاش کیا لیکن

کچھ پتہ نہ چلا۔ چند روز فرید آباد میں ٹھہر رہا جب تندتھا ٹھیکہ گئی تو منزل بمنزل پیدل چل کر
جھوپالی آیا۔ کیونکہ یہاں میرے والد کے دوستوں میں کیلہ میرے رہتے تھے۔ جھوپال پہنچ کر معلوم
ہوا کہ ان امیر کا انتقال ہو گیا لہٰذا وارثوں نے بہت بے توجہی برتی۔ آخر میں یکے دوسرے
امیر کے ہاں چوکیداروں میں نوکر ہو گیا اور تمام زندگی اسی جگہ گزار دی۔

انسپکٹر پولیس نے یہ بیان شکر محروسے کہا بیشک یہ عزت دار آدمی ہے تم اس سے معافی مانگو
اسکے بعد حکم دیا کہ اسکی بیٹی کو تلاش کیا جائے۔ اور جب نکل سکا حال معلوم ہوا اسکے کھانے کا
خرچہ میں دنگا۔ چار دن کے بعد معلوم ہوا کہ کسی بد معاش نے اس کی لڑکی کو بچہ کر کہیں
چھپا دیا اور وہ اس سے بڑاری پیشہ کرانا چاہتا تھا۔ مجھوں نے سراغ نکال لیا بد معاش
کو سزا ہوئی اور شہزادہ لڑکی کو لیکر انسپکٹر کے خرچ سے جھوپال چلا آیا۔

چلتے وقت شہزادہ نے انسپکٹر کا بہت شکریہ ادا کیا اور کہا بڑا اچھا ہے کہ میں نے
کہا تھا کہ جب بابر و ہمایوں نے ہندوستان فتح کیا تو وہ ڈاکو تھے اور آج آپ
شہزادہ ہیں اور جب میں شہزادہ تھا۔

جدید اضافہ

الحمد للہ غدر دہلی کے افسانوں کا یہ چھٹا ایڈیشن شائع ہوتا ہوا ہے اس میں سو وہ مضامین
جن کا تعلق خاص حالات غدر سے نہ تھا بلکہ صرف شاہی خاندان کی تباہی کا
ذکر ان میں تھا نکال دئے گئے۔ ان مضامین کو سی پارہ دل حصہ دوم میں راج
کیا جائے گا۔

ان مضامین کی جگہ نئے قصے کھنڈی وغیرہ بڑا دلوگو جو خارج شدہ مضامین کی صفحات میں
کچھ زیادہ ہیں۔ اور باوجود اسی مزید اضافہ کے قیمت نہیں بڑھائی گئی۔

حسن نظامی

۴ نومبر ۱۹۲۲ء

Hasan

